سورۃ الحجر

نام:

اس سورت کا نام اَلْحِجْرِ ہے اور اس میں 6 رکوع اور 99 آیات ہیں۔ حجر کے معنی پتھر ہیں اور الحجر اس وادی کا نام ہے جس میں حضرت صالح علیہ السلام کی قوم یعنی ثمود رہتے تھے۔ اس قوم کا مسکن نہ صرف اہل مکہ کے بالکل قریب تھا بلکہ اس رستہ پر تھا جو مکہ سے شام کو جاتا تھا اور جس پر ان کے قافلے آتے جاتے تھے۔ اور سخت دلی میں بھی معلوم ہوتا ہے یہ قوم اپنی نظیر آپ ہی تھی۔ جو کچھ انہوں نے حضرت صالح علیہ السلام کے خلاف منصوبے اور سازشیں کیں وہ بعینہٖ ایسے تھے جیسے قریش نے ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کیے۔ اسی مناسبت سے اس سورت کا نام الحجر ہے اور اس کے ساتھ ہی اس سورت میں دو اور قوموں کا ذکر ہے یعنی حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم اور حضرت لوط علیہ السلام کی جن کے مسکن اسی راستہ پر تھے۔ جس پر ثمود کا مسکن تھا اور یہ تینوں قومیں ایک ہی عذاب یعنی زلزلہ سے تباہ ہوئیں۔

خلاصہ مضمون:

① پہلے رکوع میں قرآن کریم کی حفاظت ابدی کا ذکر ہے۔ یعنی نہ صرف یہ حق جو قرآن لایا ہے دشمنوں کے حملوں سے محفوظ رہے گا بلکہ تحریف وغیرہ سے بھی یہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوگا۔

② دوسرے رکوع میں بتایا کہ شیاطین اس حق کو نابود نہیں کر سکتے بلکہ وہ خود اس سے نابود ہو جائیں گے اور کہانت، نجوم وغیرہ اس کی بدولت مٹ جائیں گے۔

③ تیسرے میں بتایا کہ شیطان کے پیچھے لگ کر انسان حصول مقصد زندگی میں ناکام رہتا ہے اور

④ چوتھے میں اس کے متعلق متقی کی کامیابی کا ذکر کیا۔

⑤ پانچویں میں لوط اور شعیب علیہما السلام کی قوموں کی تباہی کا اور

⑥ چھٹے کے شروع میں قوم ثمود کی بربادی کا ذکر کر کے اعدائے اسلام کو انذار کیا۔

تعلق:

الٓرٰ کے مجموعہ کی یہ چھٹی سورت ہے۔ اس کے بعد جو ساتویں سورت اس مجموعہ میں آتی ہے الٓرٰ سے شروع نہیں ہوتی۔ جب پچھلی سورت میں مثال سے سمجھایا کہ حق کو کوئی طاقت نابود نہیں کر سکتی تو اب یہاں نہایت صفائی سے قرآن کریم کی حفاظت ابدی کا ذکر کیا اور بتایا کہ باطل حق کو نابود نہیں کرے گا بلکہ خود حق کے سامنے نابود ہو جائے گا۔ اور حق کا مقابلہ کرنے والوں میں

اٰیَاتُهَا 99 (15) سُوْرَةُ الْحِجْرِ مَكِّيَّةٌ (54) رُكُوْعَاتُهَا 6

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

الٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَ قُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝۱

میں اللہ دیکھنے والا ہوں۔ یہ کتاب کی آیتیں ہیں اور قرآن کی جو کھول کر بیان کرنے والا ہے۔ (1671)

رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ۝۲

بسا اوقات کافر چاہیں گے کہ کاش وہ مسلمان ہوتے۔ (1672)

الجزء الرابع عشر (14)

سے وہ تین مثالیں پیش کیں جو اہل مکہ کی نظر کے سامنے شب و روز آتی تھیں۔ باقی تو عموماً تذکرے تھے جو وہ سنتے تھے۔ مگر ان قوموں کا انجام اپنی آنکھوں سے بھی دیکھتے تھے۔

زمانۂ نزول:

اس سورت میں بھی کئی اشارات موجود ہیں کہ یہ مکہ کے آخری زمانہ کی نازل شدہ سورت ہے۔ بالخصوص مُقْتَسِمِيْنَ کے ذکر میں ان کا قسمیں کھا کر آپ کے خلاف آخری تدابیر اختیار کرنے کی طرف اشارہ ہے۔

1671 - یہاں ﴿قُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ﴾ کا عطف الْكِتٰبِ پر ہے۔ الْكِتٰبِ سے مراد بھی قرآن شریف ہی ہے مگر چونکہ یہ لفظ جنس کتاب پر بھی بولا گیا ہے اور اس کے لانے میں یہ بھی اشارہ ہے کہ جس طرح پہلے انبیاء علیہم السلام پر کتابیں نازل ہوتی رہیں اسی طرح یہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک وحی ہے۔ اس لیے قرآن کا لفظ ساتھ لا کر بتا دیا کہ آئندہ یہی کتاب دنیا میں پڑھی جائے گی اور ساتھ اس کی صفت بھی بیان کر دی کہ یہ ان تمام باتوں کو کھول کر بیان کرنے والی ہے جو پہلی کتابوں میں اجمال کے طور پر بیان ہوئی ہیں اور قرآن کی تنکیر بمقابلہ الْكِتٰبِ کے یہاں اس کی عظمت پر دلالت کرتی ہے۔

1672 - ﴿رُبَمَا﴾۔ رَبَّ کے معنی تربیت ہیں اور اسی سے [اَرَبَتِ السَّحَابَةُ] کے معنی ہو گئے ہیں بادل ہمیشہ رہا۔ گویا بلحاظ اس کی تربیت یعنی سبزیوں کی نشوونما دیتا رہنے کے اس میں اقامت کے معنی آ گئے اس لیے رَبّ میں استقلال کے معنی ہیں اور رُبّ اور رُبَمَا اس چیز پر بولا جاتا ہے جو بار بار ہوتی رہے۔ (غ)

کافروں کی مسلمان ہونے کی آرزو:

کب ایسی آرزو کریں گے؟ قیامت کے دن تو ایسا کرنا ظاہر ہی ہے جب انکشاف حقیقت پورے طور پر ہو جائے گا اور ضحاک کا قول ہے کہ یہ موت کے وقت دنیا میں ہوگا اور سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ یہ آیت کفار قریش کے بارہ میں ہے اور یہ ان کا

ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا وَ يَتَمَتَّعُوْا وَ يُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝٣

انہیں چھوڑ دو کھائیں اور فائدہ اٹھائیں اور آرزو سے (دنیا) انہیں غافل کیے رکھے عنقریب جان لیں گے۔

وَ مَاۤ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَ لَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ ۝٤

اور ہم نے کسی بستی کو ہلاک نہیں کیا مگر اس کے لیے ایک میعاد مقرر تھی۔

مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَ مَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ۝٥

کوئی جماعت اپنے وقت سے پہلے نہیں جاسکتی اور نہ وہ پیچھے رہ سکتے ہیں۔

وَ قَالُوْا يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ۝٦

اور کہتے ہیں اے شخص جس پر نصیحت اتاری گئی ہے یقیناً تو پاگل ہے۔

لَوْ مَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝٧

تو فرشتوں کو ہمارے پاس کیوں نہیں لے آتا، اگر تو سچوں میں سے ہے۔

آرزو کرنا بدر کے دن تھا، جب اہل اسلام کا غلبہ دیکھا۔ (ر) ظاہر ہے کہ یہ پیشگوئی کا رنگ ہے اور رُبَمَا لا کر بتایا کہ یہ اکثر اوقات میں ہوگا۔ پس یہ ان کی آرزو ہر غلبہ کے وقت میں ہوگی جو اسلام کو حاصل ہوگا۔ یہاں تک کہ اس کے کامل غلبہ کا وقت آجائے گا اور سیاق عبارت اسی کو چاہتا ہے۔ کیونکہ ابھی پچھلی سورت کے آخری رکوع میں کفار کی مغلوبیت کا نقشہ کھینچا جاچکا ہے۔ اسی کی طرف یہاں اشارہ ہے کہ جب یہ اپنی مغلوبیت کے نظارہ کو دیکھیں گے تو پھر یہ بھی آرزو کریں کہ ہم مسلمان ہی ہوتے۔ یہی مضمون اگلی آیت کا بھی ہے جہاں صاف فرمایا کہ ایک غلط آرزو نے انہیں حق کی طرف سے غافل کر رکھا ہے اور اس سے بعد کی آیتیں جہاں ملائکہ کے آنے کا ذکر ہے جو جنگوں میں ہوا، سب اسی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ کیونکہ اسلام میں ان کو برائی تو کوئی نظر نہ آتی تھی، ہاں ان کے دلوں میں یہ تکبر بھرا ہوا تھا جس طرح آج مخالفین اسلام کے دلوں میں بھرا ہوا ہے کہ ہم اسلام کو تباہ کر کے رہیں گے۔ سو ہر مغلوبیت کا نظارہ ان کے دلوں میں یہ آرزو پیدا کرنے والا تھا کہ کاش ہم مسلمان ہی ہو گئے ہوتے۔ یہاں تک کہ کامل غلبہ اسلام کے وقت جو فتح مکہ میں ہوا وہ آخر مسلمان ہو بھی گئے۔ اس وقت بھی ان کو افسوس ہوتا ہی ہوگا کہ ہم نے کیوں خواہ مخواہ ایسی صداقت کی مخالفت کی اور اتنی مدت تک اس سے اپنے آپ کو محروم رکھا۔

مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ مَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ ۝۸

ہم فرشتوں کو نہیں اتارتے مگر جب حکمت چاہتی ہو اور اس وقت ان کو مہلت بھی نہ دی جائے گی۔ (1673)

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝۹

ہم نے خود یہ نصیحت اتاری ہے اور ہم خود ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ (1674)

1673- بِالْحَقِّ یا اقتضائے حکمت سے [دیکھو نمبر: 65] **فرشتوں کے اتارنے سے مراد** یہ ہے کہ وہ تو تمہاری سزا کے لیے نازل ہوں گے۔ اس لیے آگے فرمایا کہ جب فرشتے آ جائیں گے تو پھر سزا بھی ساتھ ہی آ جائے گی۔ فرشتوں اور سزاؤں کا آنا دو الگ الگ باتیں نہیں۔ ان سب آیات میں ان کی مغلوبیت کی طرف اشارہ ہے اور وہ جو مجنون کہتے ہیں [آیت نمبر: 6] تو مراد یہ ہے کہ یہ پاگلوں کی سی باتیں ہیں کہ ہم بھی کبھی مغلوب ہو جائیں گے۔

1674- اَلذِّكْرُ قرآن شریف کے ناموں میں سے ایک نام ہے [دیکھو نمبر: 191 و 451]۔ اور یہاں یہی مراد ہے۔ جیسا کہ [آیت نمبر: 6] میں ﴿نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ﴾ کہہ کر صاف کر دیا ہے اور خود سیاق عبارت یہی چاہتا ہے کہ یہاں ذکر **حفاظت قرآن** کا ہے۔ اس لیے کہ کفار کو اپنے ظاہری غلبہ پر فخر تھا اور پچھلی سورت میں ان کی تدابیر کا ذکر ہو چکا کہ وہ حق کو کس طرح ملیامیٹ کرنا چاہتے ہیں۔ تو اب صفائی سے بتا دیا کہ کفار کا کتنا بھی غلبہ ہو وہ اس حق کو جو قرآن شریف میں نازل ہوا اب دنیا سے مٹا نہیں سکتے۔ نہ صرف یہ کہ وہ مٹا نہیں سکتے بلکہ اس میں کسی قسم کی تحریف کمی بیشی بھی نہ ہوگی۔ کیونکہ اس کی حفاظت کو ہم نے اپنے ذمہ لیا ہے۔ برخلاف دیگر کتب سماوی کے جن کی حفاظت ان کے پیروؤں کے سپرد کی گئی تھی۔ جیسا کہ ﴿اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ﴾ [المائدۃ: 44:5] ''اللہ کی کتاب کی حفاظت کرنے کو انہیں کہا گیا تھا'' سے ظاہر ہے۔

حفاظت قرآن سے مراد یہ ہے کہ اس میں کوئی کمی بیشی تغیر تبدل نہ ہو۔ یہ ایک دعویٰ جس کی صداقت آج دشمنوں تک کو مسلم ہے۔ میور کہتا ہے:

> ''جہاں تک ہماری معلومات ہیں دنیا بھر میں ایک بھی ایسی کتاب نہیں جو اس کی طرح بارہ صدیوں تک ہر قسم کی تحریف سے پاک رہی ہو۔''
>
> پھر وان ہیمر کا قول نقل کرتا ہے: ''ہم ایسے ہی یقین سے قرآن کو بعینہٖ محمد (ﷺ) کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ سمجھتے ہیں جیسے مسلمان اسے خدا کا کلام سمجھتے ہیں۔''

اور واقعات خود بھی بتاتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ کتاب جس کے پہلے دن سے لکھے جا کر بکثرت نسخے ہر قوم اور ہر ملک میں شائع ہوئے اور آخر مشرق سے مغرب تک پھیل گئے ان ہزار در ہزار قدیم ترین نسخوں میں ایک بھی ایسا نسخہ نہیں ملتا جس میں ایک

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ ⑩

اور ہم تجھ سے پہلے اگلی امتوں میں رسول بھیج چکے ہیں۔

وَ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ⑪

اور کوئی رسول ان کے پاس نہیں آتا رہا مگر اس سے وہ ہنسی کرتے تھے۔

كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ⑫

اسی طرح ہم اسے مجرموں کے دلوں میں داخل کرتے ہیں۔ (1675)

لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَ قَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ ⑬

وہ اس پر ایمان نہیں لاتے اور پہلوں کا بھی یہی طریق رہا۔ (1676)

حرف کا یا ایک زیر وزبر کا فرق ہو۔ اہل تشیع سے محقق اس کی حفاظت کے ہی قائل ہیں۔ اور اگر نہ ہوں تو اس الزام کے نیچے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی خلافت میں قرآن کو کیوں مکمل نہ کیا۔ یہ ایک وسیع مضمون ہے جس پر پوری تحقیقات میں نے اپنی کتاب جمع قرآن میں شائع کی ہے اور یہاں اس کو دہرانے کی گنجائش نہیں۔

1675 - نَسْلُكُ۔ سُلُوْكٌ کے معنی ہیں [اَلنَّفَاذُ فِي الطَّرِيْقِ] ایک رستہ پر چلنا۔ ﴿فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ﴾ [النحل: 69:16] ''اپنے رب کے رستوں پر چلی جا۔'' ﴿لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ۝﴾ [نوح: 20:71] ''تاکہ تم اس کے کھلے رستوں میں چلو۔'' اور دوسرے کو کسی رستہ پر چلانے پر بھی بولا جاتا ہے۔ جیسے ﴿مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ۝﴾ [المدثر: 42:74] ''تمہیں کیا چیز دوزخ میں لائی۔'' اور جیسے یہاں۔ (غ)

پچھلی آیت میں فرمایا تھا کہ وہ ہر رسول سے استہزا کرتے ہیں۔ یہاں كَذٰلِكَ سے شروع کر کے بتایا کہ جس طرح وہ وحی الٰہی کے متعلق طریق استہزا اختیار کرتے ہیں اسی طرح ہم بھی ان کو اسی رستہ پر چلاتے ہیں کہ وہ ایمان نہیں لاتے۔ گویا اللہ تعالیٰ کا انہیں ایک راہ پر چلانا ان کے اپنے فعل کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ صرف انہی لوگوں کو ایمان نہ لانے کی راہ پر چلاتا ہے جو استہزا کرتے ہیں۔ اس لیے کہ استہزا کرنے والا کبھی غور کرتا ہی نہیں اور بغیر غور کرنے کے انسان صحیح نتیجہ پر پہنچ نہیں سکتا۔

1676 - ﴿سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ﴾ سے مراد اللہ تعالیٰ کی سنت اولین میں ہے یعنی جن لوگوں نے استہزا کو اپنا طریق رکھا وہ ہمیشہ حق سے محروم ہی رہے۔

وَ لَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ ﴿۱۴﴾

اور اگر ہم ان پر آسمان کا کوئی دروازہ کھول دیں پھر وہ اس میں چڑھنے لگیں۔ (1677)

لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ ﴿۱۵﴾ ع 1 15 1

تو کہیں گے ہماری آنکھوں پر پردہ ڈال دیا گیا، بلکہ ہم وہ لوگ ہیں جن پر جادو کر دیا گیا ہے۔ (1678)

وَ لَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ زَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿۱۶﴾

اور یقیناً ہم نے آسمان میں ستارے بنائے اور اسے دیکھنے والوں کے لیے سجایا۔

وَ حَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ﴿۱۷﴾

اور اسے ہر شیطان مردود سے محفوظ کیا۔

اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۸﴾

ہاں جو چھپ کر کچھ سن لے تو اسے روشن کرنے والا انگارا آلیتا ہے۔ (1679)

1677 - ﴿يَعْرُجُوْنَ﴾ میں عموماً مراد خود کفار کو لیا گیا ہے کہ وہ آسمان پر چڑھنے لگیں۔ مگر قتادہ اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ مراد ملائکہ ہیں۔ (ر) اور سیاق عبارت بھی یہی چاہتا ہے کیونکہ فرشتوں کے متعلق ہی ان کا اقتراح تھا۔ تو فرمایا کہ اگر آسمان کا دروازہ کھول دیں اور فرشتے نازل ہوں اور ان کو سزا دے کر پھر چڑھنے بھی لگیں تو پھر بھی یہ مانیں گے نہیں اور صورت اول میں آسمان پر چڑھنے سے مراد سچ مچ اوپر چڑھنا نہیں بلکہ استعارہ کے رنگ میں یہ مراد ہوگی کہ بعض سماوی باتیں ان کو سمجھ بھی آنے لگیں۔ پھر بھی ان کو یہ کہہ کر رد کر دیں گے کہ ہماری آنکھوں پر پردہ ڈال دیا گیا ہے اور یہ ذکر شدید ترین مخالفوں کا ہے۔

1678 - ﴿سُكِّرَتْ﴾۔ سَكْرٌ کے معنی [حَبْسُ الْمَآءِ] یعنی پانی کا روک دینا بھی ہیں اور حالت سکر وہ حالت ہے جو انسان اور اس کی عقل کے درمیان پردہ حائل کر دیتی ہے۔ (غ) اس لیے [سُكِّرَ بَصَرُهُ] کے معنی ہیں اس پر پردہ ڈال دیا گیا اور یہاں یہ معنی بھی کیے گئے ہیں کہ انہیں دیکھنے سے روک دیا گیا۔ (ل)

مَّسْحُوْر۔ سحر کے لیے [دیکھو نمبر: 129]۔ ﴿مَّسْحُوْرُوْنَ﴾ سے مراد ہے کہ ہمیں صحیح طور پر شناخت کرنے سے سحر کے ساتھ روک دیا گیا ہے۔ (غ) اس آیت میں اور اس سے پہلی آیت میں بتایا ہے کہ جب انسان لہو ولعب کو اور اس حیوانی زندگی کو ہی اپنا مقصد بنا لیتا ہے تو کتنے کھلے نشان اس کے سامنے ظاہر ہوں پروا نہیں کرتا۔

1679 - بُرُوْجٌ۔ بُرْجٌ کی جمع ہے اور مراد ستارے ہیں [دیکھو نمبر: 696]۔ قرآن کریم نے خود اس معنی کو واضح کر دیا ہے جب دوسری جگہ

وَ الْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَ اَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ ﴿۱۹﴾

اور زمین کو ہم نے پھیلایا اور ہم نے اس میں پہاڑ بنائے اور اس میں ہم نے ہر ایک چیز اندازہ کی ہوئی اگائی۔

بجائے بروج کے لفظ کواکب اختیار فرمایا ﴿اِنَّا زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِزِيْنَةِ ِۨالْكَوَاكِبِ ۝ وَ حِفْظًا مِّنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ مَّارِدٍ ۝﴾ [الصافات: 37:6-7] ''ہم نے ورلے آسمان کو (عجیب) زینت (یعنی) ستاروں سے آراستہ کیا ہے۔ اور ہر سرکش شیطان سے (ان کی) حفاظت کی ہے۔'' تیسری جگہ انہی کواکب کو مصابیح کہا ہے ﴿وَ لَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَ جَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ﴾ [الملك: 67:5] ''اور ہم نے ورلے آسمان کو ستاروں سے زینت دی اور انہیں شیطانوں کے لیے اٹکل بازی کا ذریعہ بنا دیا۔''

رَجِيْمٍ۔ [دیکھو نمبر: 410] لسان العرب میں رَجْمٌ کے معنی حسب ذیل دیئے ہیں۔ قتل، پتھر مارنا، طَرْدٌ یعنی دور کرنا، ظن، سب و شتم اور رَّجِيْمٍ کے یہ معنی لینا کہ اسے سچ مچ پتھر مارے جاتے ہیں یا شہاب اس پر پھینکے جاتے ہیں اس لیے اسے رَّجِيْمٍ کہا جاتا ہے درست نہیں۔ بلکہ رَّجِيْمٍ بمعنی ملعون ہے جو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور کیا گیا ہے اور یہ معنی لسان العرب نے قبول کے ہیں اور قرآن کریم نے خود اسے صاف کیا ہے جہاں [آیت: 34] میں شیطان کو بوجہ ایک اچھی حالت سے دور کیا جانے کے لیے رَجِيْمٍ کہا ہے نہ اس لیے کہ اسے کسی نے پتھر مارے تھے اور یہ بھی قبول کیا ہے کہ ﴿رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ﴾ [الملك: 67:5] میں (اور ایسا ہی یہاں) یہاں **شیاطین سے مراد انسان شیطان ہیں یعنی کاہن وغیرہ** جو اٹکل پچو باتیں اخبار غیبی کے متعلق کرتے رہتے ہیں اور یہ معنی ابن اثیر سے لیے ہیں۔

اسْتَرَقَ۔ سَرِقَةٌ کسی چیز کا چھپ کر لینا ہے جو لینے والے کی نہیں اور ﴿اسْتَرَقَ السَّمْعَ﴾ چھپ کر بات سننے کو کہتے ہیں۔ (غ) شِهَابٌ روشن شعلہ کو کہتے ہیں جو جلتی ہوئی آگ سے لے لیا جائے جو فضا میں نظر آتا ہے۔ (غ) ﴿اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ﴾ [طٰهٰ: 20:10] ''میں نے آگ دیکھی ہے شاید میں تمہارے پاس اس میں سے (ایک) شعلہ لے آؤں۔''

شیاطین کا ملائکہ کی باتوں کو سننا:

[آیت نمبر: 16] میں یہ بیان فرمایا کہ آسمان میں بروج بنائے اور [آیت نمبر: 17] میں یہ کہ ان ستاروں کو ہر شیطان مردود سے محفوظ رکھا ہے۔ بعینہ یہی مضمون سورہ الصافات میں ہے جہاں بروج کی بجائے کواکب کا لفظ رکھ کر بتا دیا کہ بروج سے مراد کواکب یا ستارے ہی ہیں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ آسمان یا ستاروں کو شیاطین سے حفاظت میں رکھنے سے کیا مراد ہے اور دوسرا یہ کہ استراق سمع کیا ہے یا چھپ کر کس چیز کو شیاطین سنتے ہیں اور تیسرا یہ کہ شہاب ثاقب کے پیچھے آنے سے کیا مراد ہے۔ وہ بات جسے مفسرین نے عام طور پر قبول کیا ہے اس کی بنیاد بخاری کی ذیل کی حدیث پر ہے جو اسی آیت کی تفسیر میں ہے۔ ملخصاً اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی امر کا فیصلہ کرتا ہے (اور اس حدیث کی دوسری روایت میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ وحی بھیجنے کے لیے کلام کرتا ہے) تو فرشتے اظہار عاجزی کرتے ہیں اور ایسی آواز سنتے ہیں جیسے پتھر پر زنجیر مارنے کی

آواز ہوتی ہے۔ جب ان کا ڈر جاتا رہتا ہے تو دوسرے فرشتے ان سے دریافت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کیا فرمایا تو وہ کہتے ہیں حق فرمایا اور وہ علی وکبیر ہے تو چھپ کر سننے والے بھی اس میں سے کچھ سن لیتے ہیں اور وہ ایک دوسرے کے اوپر تہہ بہ تہہ ہوتے ہیں۔ پھر شہاب یعنی انگارا کبھی تو اس سننے والے کو ہلاک کر دیتا ہے اور کبھی وہ انگارے سے ہلاک ہونے سے پیشتر اپنی بات دوسرے کو پہنچا دیتا ہے یہاں تک کہ وہ زمین تک اس بات کو پہنچا دیتے ہیں اور وہ ساحر (یا کاہن) کے منہ میں ڈالی جاتی ہے جو اس کے ساتھ سو جھوٹ ملا کر اسے بیان کرتا ہے اور جب وہ ایک بات سچی نکل آتی ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ دیکھو اس نے سچ بولا تھا۔ اور طبرانی کی روایت میں یوں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ وحی بھیجنے کے لیے کلام کرتا ہے تو آسمان کانپ اٹھتا ہے اور آسمان والے کلام سنتے ہی بیہوش ہو جاتے ہیں اور سجدہ میں گر پڑتے ہیں۔ سب سے پہلے جبریل سر اٹھاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے ان سے فرماتا ہے۔ تب فرشتے ان سے پوچھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کیا فرمایا۔ تو وہ فرماتے ہیں [الْحَقَّ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ] (صحيح بخاری، كتاب التفسير، باب قَوْلِهِ:إِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَأَتْبَعَهُ شِهَابٌ مُبِينٌ،حديث: 4701)

ان احادیث سے ایک طرف تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ملائکہ جب جبریل یا ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کیا فرمایا تو جواب صرف اسی قدر ہوتا ہے [الْحَقَّ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ] اور دوسری طرف یہ شیاطین اس کلام کو سن لیتے ہیں۔ حالانکہ خود قرآن کریم نے صراحت سے اس عظیم الشان وحی کے متعلق جو قرآن کریم میں ہے فرماتا ہے کہ شیاطین اسے قطعاً نہیں سن سکتے ﴿وَ مَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ۝ وَ مَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَ مَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۝ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ ۝﴾ [الشعرآء: 210:26-212] ''اور شیطان اسے لے کر نہیں اترے اور یہ ان کے مناسب حال نہیں اور نہ وہ کر سکتے ہیں۔ وہ (وحی الٰہی کے) سننے سے دور کر دیئے گئے ہیں۔'' جہاں آخری الفاظ میں فرمایا کہ وہ سننے سے الگ کیے گئے ہیں اور انہیں اس بات کی طاقت ہی نہیں۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ قرآنی وحی کے متعلق نہیں بلکہ دوسرے امور کے متعلق ہے۔ تو اس کی بھی قرآن کریم تردید فرماتا ہے ﴿اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ ۚ فَلْيَاْتِ مُسْتَمِعُهُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝﴾ [الطور: 38:52] یعنی ان کے قبضہ میں کوئی ایسے ذرائع ہیں جن سے وہ غیب کی باتیں سن لیتے ہیں تو ان کے سننے والے کوئی کھلی کھلی دلیل لائیں۔ جس سے معلوم ہوا کہ کوئی ذریعہ اخبار غیبی کے اس طرح پر سننے کا نہیں ہے۔ اس لیے قرآن کریم کی صراحت کے مقابل پر حدیث کو قبول نہیں کیا جا سکتا۔ اور مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ پہلے شیاطین کو آسمانوں میں جانے کی کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے تو انہیں تین آسمانوں سے روک دیا گیا اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت پر سارے آسمانوں سے روک دیا گیا۔ اور یہ بات سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب ہے۔ مگر اس کی سند قرآن وحدیث میں قطعاً کوئی نہیں۔

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس قسم کی ساری آیات میں شیاطین سے مراد کاہن اور منجم ہیں جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ نجوم یعنی ستاروں سے کچھ علم حاصل کر کے آئندہ کی خبریں بتا سکتے ہیں۔ چنانچہ ﴿رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ﴾ میں ابن اثیر نے بھی اسی معنی کو قبول کیا ہے کہ رُجُوْمًا سے مراد ظنون اور شَيٰطِيْنِ سے مراد منجم اور کاہن ہیں۔ جیسا کہ لسان العرب کے حوالہ سے اوپر دکھایا جا چکا ہے اور خود الفاظ قرآنی پر غور کیا جائے تو یہی حق ثابت ہوتا ہے۔ اس لیے کہ وہاں یعنی سورہ ملک میں مصابیح یعنی ستاروں کو ﴿رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ﴾ کہا ہے۔ پس اگر مطلب یہ ہوتا کہ ان ستاروں کو شیاطین پر پھینکا جاتا ہے تو آج تک یہ آسمان کے

ستارے ختم ہو گئے ہوتے یا ان میں معتد بہ کمی نظر آتی اور واقعات بھی اس کو غلط ٹھہراتے۔ یہاں تک کہ مفسرین کو خود یہ کہنا پڑا کہ مراد خود ستاروں کو پھینکنا نہیں بلکہ ستاروں میں سے شعلہ لے کر پھینکنا ہے۔ اس تاویل بعید کی نسبت یہ سیدھی تاویل کیوں قبول نہ کی جائے کہ ﴿رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ﴾ سے مراد منجموں کے ظنون فاسدہ لیے جائیں جیسا کہ ﴿رَجْمًۢا بِالْغَيْبِ﴾ [الکھف: 22:18] ''اٹکل پچو باتیں کرتے ہیں۔'' میں رجم کا لفظ اور ﴿وَ اِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ﴾ [البقرۃ: 14:2] ''اور جب اپنے شیطانوں کے ساتھ اکیلے ہوتے ہیں۔'' میں شیاطین کا لفظ انہی معنوں میں آئے ہیں۔ تو گویا ایک طرف یہ فرما کر کہ ہم نے ستاروں کو شیاطین سے محفوظ کیا ہے یہ بتایا کہ فی الواقع ان منجموں اور کاہنوں کو علم غیب میں کچھ دسترس نہیں۔ جیسا کہ ﴿اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ﴾ [الطور: 38:52] ''کیا ان کے پاس کوئی ذریعہ ہے جس سے سن لیتے ہیں۔'' سے اور ﴿اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ ۝﴾ [الطور: 41:52] ''کیا ان کے پاس غیب ہے تو وہ لکھ لیتے ہیں۔'' سے بھی ظاہر ہے اور دوسری طرف ﴿رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ﴾ کہہ کر یہ بتایا کہ یہ محض ظنون اور اٹکلیں ہیں جو وہ دوڑاتے رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم ستاروں سے یہ علم حاصل کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ علم کوئی نہیں اور نہ ستاروں تک وہ پہنچ سکتے ہیں بلکہ محض اٹکل پچو باتیں ہیں۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ **استراق سمع سے کیا مراد ہے** اور تیسرا یہ کہ شہاب کے پیچھے آنے سے کیا مراد ہے یہ دونوں سوال باہم ملے ہوئے ہیں۔ اگر استراق سمع سے یہ مراد لی جائے کہ واقعی شیاطین جن کچھ اللہ تعالیٰ کے رازوں کو بھی چھپ کر سن لیتے ہیں تو اللہ کی قدرت کاملہ پر اعتراض ہوتا ہے کہ شیاطین بھی چھپ کر اس کے بھیدوں سے آگاہ ہو جاتے ہیں۔ گویا وہ اپنے بھیدوں کی اس قدر بھی حفاظت نہیں کر سکتا جس قدر ایک انسان کر سکتا ہے۔ دنیا کی حکومتیں تک تو اپنے اسرار پر دوسروں کو آگاہ نہیں ہونے دیتیں تو کیا اللہ تعالیٰ میں اتنی قدرت بھی نہیں۔ پھر خدا کے خبر دینے میں اور شیاطین کے اس طرح خبر حاصل کر لینے میں بھی مابہ الامتیاز اٹھ جاتا ہے۔ کیونکہ یہ تو پھر محض شیاطین کا اختیار رہا کہ ایک سچی بات کے ساتھ سو جھوٹی باتیں نہ ملائیں۔ علاوہ ازیں باوجود شہاب ثاقب کے پیچھے آنے کے بھی وہ خبر کے پہنچانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ گویا اول تو اللہ تعالیٰ اپنے رازوں کو شیطانوں سے نہیں بچا سکتا۔ پھر جب پتہ لگ بھی جاتا ہے اور راز کو بچانے کی کوشش کی جاتی ہے تو وہ کوشش بھی ناکام ہوتی ہے۔ ان باتوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا اس کی صفات کاملہ میں نقص قبول کرنا ہے۔ اور یہ اس کا جواب نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ کے انبیاء اور راستبازوں کو بھی ان کے دشمنوں کے ہاتھ سے دکھ پہنچ جاتا ہے۔ کیونکہ یہ عین اس کی صفت کا تقاضا ہے کہ بشر رسول سارے ان حالات کے ماتحت ہو جو دوسرے انسانوں کو پیش آتے ہیں اور اس کی قدرت کاملہ کا اظہار یہی ہے کہ باوجود دشمنوں کے ہاتھ میں پڑ جانے کے بھی وہ آخر کار اس کو بچا لیتا ہے۔ مگر وہ راز جن کا علم اللہ سوائے اپنے رسولوں یا برگزیدوں کے دوسروں کو نہیں دینا چاہتا شیاطین بھی اس علم کو حاصل کر لیں تو یہ اس کی صفات کاملہ میں نقص ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی درست نہیں کہ یہ سلسلہ شہاب کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وقت سے شروع ہوا جیسا کہ مفسرین نے لکھا ہے کہ اس سے پہلے شیاطین ان رازوں سے اچھی طرح واقف ہو جایا کرتے تھے اور کوئی روک نہ تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وقت میں تین آسمانوں سے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وقت میں سب آسمانوں سے انہیں روک دیا گیا۔ کیونکہ شہب کا سلسلہ اس وقت سے ہے جب سے دنیا ہے۔ اور یہ بے معنی بات ہے کہ پہلے یہ سلسلہ شہب یوں ہی تھا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وقت سے شیاطین کی سزا کے لیے ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ کے قانون اس طرح تبدیل نہیں ہوجاتے۔سلسلہ شہب جس غرض کے لیے ہے وہ ہمیشہ سے ایک ہی ہونی چاہیے۔اور اس بحث میں عجیب تر وہ آیت قرآنی ہے جس میں فرمایا ﴿وَّ اَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ؕ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ۙ﴾[الجن: 9:72] ''اور کہ ہم اس کے بیٹھنے کی جگہوں میں سننے کے لیے بیٹھا کرتے تھے مگر جو کوئی اب سننے کی کوشش کرتا ہے وہ اپنے لیے شعلہ تیار پاتا ہے۔'' جس سے معلوم ہوا کہ وہ پہلے گھات میں بیٹھ کر باتیں سن لیا کرتے تھے صرف رسول اللہ ﷺ کے ظہور پر شہاب کا آنا شروع ہوا (یہ جن بھی انسان ہی ہیں جیسا کہ اپنے موقعہ پر دکھایا جائے گا) اس مشکل کو قرآن شریف دولفظوں میں حل کر دیتا ہے جہاں ﴿يُلْقُوْنَ السَّمْعَ﴾[الشعرآء: 223:26] ''وہ کان لگاتے ہیں۔'' میں القائے سمع شیاطین کی طرف ہے۔یعنی یہ منجم یا کاہن شیاطین سے کچھ علم حاصل کرنا چاہتے ہیں اور جس طرح القائے سمع سے مراد فرشتوں کی باتیں سننا نہیں اسی طرح استراق سمع سے مراد چھپ کر فرشتوں کی باتیں سننا نہیں اور جسے ایک جگہ استراق سمع کہا ہے اسے دوسری جگہ یوں ادا کیا ہے ﴿اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ﴾[الصافات: 10:37] ''سوائے اس کے جو ایک (آدھ) دفعہ اچک لے جائے۔'' اور یہ ایک دفعہ اچک لے جانا درحقیقت ایک آدھ بات میں کامیاب ہوجانا ہے۔جب انسان اٹکل پچو باتیں کرتا ہے اور قیاس سے کام لے کر کچھ آئندہ کی خبریں دیتا ہے تو بیس باتوں میں سے دو چار سچی بھی نکل آتی ہیں۔چونکہ جس طرح رسول کا تعلق اللہ سے ہوتا ہے کاہنوں اور منجموں کا تعلق شیاطین سے ہوتا ہے اور یہ کاہن یا منجم ان باتوں کو مخفی طور پر حاصل کرنے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں۔اس لیے ان باتوں کو القائے سمع اور استراق سمع فرمایا۔

شہاب کا شیطان کے پیچھے آنا:

اب صرف ایک سوال باقی رہ جاتا ہے کہ ﴿شِهَابٌ مُّبِيْنٌ﴾ یا ﴿شِهَابٌ ثَاقِبٌ﴾[الصافات: 10:37] ''روشن انگارا'' سے کیا مراد ہے۔شہاب کا لفظ بروئے لغت ہر شعلہ پر بھی صادق آتا ہے اور اس شعلہ پر بھی جو فضائے آسمان میں بعض وقت دکھائی دیتا ہے۔شہاب کا گرنا یا جس کو ہم ستارے کا ٹوٹنا کہتے ہیں اصل میں کیا چیز ہے۔وہ بعض پتھر ہیں جو فضائے آسمان میں چکر لگاتے ہیں جس طرح بڑے بڑے سیارے چکر لگاتے ہیں۔جب ان میں سے کوئی ہمارے کرہ ہوائیہ میں داخل ہوتا ہے تو ہوا کی رگڑ سے بوجہ اپنی تیزی حرکت کے جل اٹھتا ہے اور شعلہ کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔پھر بعض وقت اس کا کچھ حصہ زمین پر بھی گر پڑتا ہے۔اگر ان پتھروں سے اللہ تعالیٰ کوئی اور کام بھی لیتا ہے تو اس کے رازہائے سربستہ سے کون آگاہ ہوسکتا ہے۔اگر شیاطین کی ہلاکت بھی ان کی ایک غرض ہو تو یہ کوئی بعید بات نہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے ظہور پر یہ شہب کثرت سے گرے اور ایسا ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وقت میں۔شاید اسی سے مفسرین نے یہ استدلال کیا ہو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وقت میں شیاطین تین آسمانوں سے اور آنحضرت ﷺ کے وقت میں سارے آسمانوں سے روک دیئے گئے (یہ بھی ایک لطیفہ ہے کہ جو لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جسم کے ساتھ آسمان پر چڑھ جانے کے قائل ہیں وہ انہیں چوتھے آسمان پر جگہ دیتے ہیں اور یہ آسمان بموجب اس خیال کے ابھی ایسا تھا جہاں شیاطین کا دخل تھا) سوال صرف یہ ہے کہ آیا یہاں شہاب سے مراد یہی ظاہری شہاب ہے۔اس پر آیت ﴿وَّ اَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ؕ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ۙ﴾[الجن: 9:72] ''اور کہ ہم اس کے بیٹھنے کی جگہوں میں سننے کے لیے بیٹھا کرتے تھے مگر جو کوئی اب سننے کی کوشش

وَ جَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ وَ مَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ ﴿۲۰﴾

اور تمہارے لیے اس میں روزی کا سامان بنایا اور اس کے لیے (بھی) جسے تم رزق نہیں دیتے۔ (1680)

وَ اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ ۫ وَ مَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۲۱﴾

اور کوئی چیز نہیں مگر اس کے خزانے ہمارے ہی پاس ہیں اور ہم اسے ایک مناسب انداز سے اتارتے رہتے ہیں۔ (1681)

کرتا ہے وہ اپنے لیے شعلہ تیار پاتا ہے۔'' سے کھلی روشنی پڑتی ہے۔ یہ شہاب ظاہری پہلے بھی تھے مگر آیت کہتی ہے کہ پہلے ایسے نجومی آزادی سے اپنا کام کرتے تھے، اب ان سے کچھ اور سلوک ہوتا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ یہاں شہاب سے مراد یہ شہاب ظاہری نہیں بلکہ اس شہاب سے استعارۃً کوئی ایسی روشنی مراد ہے جو ان کاہنوں کے استراق سمع کے اثر کو زائل کر دیتی ہے یعنی کچھ ان کی اٹکل پچو باتیں جو سچی نکل آتی ہیں تو اس سے لوگوں پر ایک اثر ہوتا ہے۔ پہلے اس اثر کو دور کرنے والی کوئی چیز نہ تھی اور اس لیے لوگ کہانت اور نجوم کے اثر کے قائل تھے۔ لیکن اب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ایسی روشنی آ گئی ہے جو اس کے اثر کو دور کر دتی ہے۔ یہ شہاب پیغمبر کے آنے سے خاص ہے۔ شہاب ظاہری پیغمبر کے آنے سے خاص نہیں۔ پس اس شہاب سے مراد پیغمبر کی وہ کھلی پیشگوئیاں ہیں جو نجومیوں کی دھندلی پیشگوئیوں کے اثر کو باطل کر دیتی ہیں۔ یہی چیز ہے جو پیغمبر سے خاص ہے سوائے اس کے اس آیت کے کوئی معنی نہیں ہو سکتے اور شہاب کے لفظ کا یہ استعمال کچھ بھی بعید نہیں۔ جب خود رسول اللہ ﷺ کو بھی النجم الثاقب فرما دیا ہے بلکہ ﴿وَ النَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۙ﴾ [النجم: 1:53] ''ستارہ گواہ ہے جب وہ ڈوبتا ہے۔'' اور ﴿فَلَاۤ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ۙ﴾ [الواقعة: 75:56] ''(ایسا) نہیں میں قرآن کے حصوں کے نزول کی قسم کھاتا ہوں۔'' میں خود مفسرین کو یہ امر مسلم ہے کہ نجم سے مراد قرآن کریم کا ایک ٹکڑا ہے۔ پس یہی مراد شہاب سے بھی لی جائے گی۔ جب ظاہری معنی کو واقعات غلط ٹھہراتے ہیں۔

سیاق مضمون خود اس معنی کو چاہتا ہے۔ اس لیے کہ پچھلے رکوع میں حفاظت قرآن شریف کا ذکر تھا اور چونکہ اس کے اعدا میں اگر ایک طرف سیاسی طاقت تھی تو دوسری طرف نجومیوں اور کاہنوں کی طاقت تھی جو لوگوں کو اپنے اثر باطل سے مرعوب کر رہے تھے۔ اس لیے یہ ضروری تھا کہ بتایا جاتا کہ ان کا اثر بھی دور کیا جائے گا۔ چنانچہ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ نجوم اور کہانت جو ملک عرب میں بت پرستی کی طرح مروج تھے نبی کریم ﷺ کے ظہور سے بالکل نابود ہو گئے اور وہ سرزمین اس نجاست سے بھی پاک ہو گئی۔

1680 - ﴿مَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ ﴿۲۰﴾﴾ سے مراد مجاہد کے نزدیک چار پائے وغیرہ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ انسانوں کے لیے بھی اس میں سامان بنایا اور دوسری مخلوق کے لیے بھی جو گو تمہارے ماتحت ہیں مگر رزق اسے تم نہیں دیتے بلکہ اللہ تعالیٰ ہی دیتا ہے۔

1681 - اس سے معلوم ہوا کہ تمام وہ چیزیں جن سے انسان فائدہ اٹھاتا ہے ان کے اصل خزانے اللہ کے پاس ہیں۔ یعنی ان کا وجود

وَ اَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْقَيْنٰكُمُوْهُ ۚ وَ مَآ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِيْنَ ﴿۲۲﴾

اور ہم (پانی سے) بھری ہوئی ہواؤں کو بھیجتے ہیں۔ تب ہم بادل سے پانی اتارتے ہیں، پھر ہم وہ تمہیں پلاتے ہیں اور تم اس کا خزانہ نہیں رکھتے۔ (1682)

وَ اِنَّا لَنَحْنُ نُحْيٖ وَ نُمِيْتُ وَ نَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ ﴿۲۳﴾

اور یقیناً ہم ہی زندہ کرتے اور مارتے ہیں اور ہم ہی وارث ہیں۔ (1683)

میں لانا اس کے قبضہ قدرت میں ہے اور پھر اللہ تعالیٰ ایک معین اندازہ سے یعنی اپنے قانون کے مطابق وہ چیزیں انسانوں کو پہنچاتا ہے۔ اَنْزَالَ اور تَنْزِیْلُ کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ ایک چیز کے اسباب مہیا کر دیئے جائیں یا اس کی طرف ہدایت کر دی جائے۔ (غ) گو وہ چیز زمین پر ہی موجود ہو۔

1682 - لَوَاقِحَ۔ [لِقَاحَ مَاءُ الْفِحْلُ] کو کہتے ہیں اور لَقِحَتْ اصل میں اونٹنی کے حاملہ ہونے پر استعمال ہوتا ہے پھر عورت کے۔ اور لَوَاقِحَ۔ لَاقِحٌ کی جمع ہے اور مراد اس سے حمل والی ہیں۔ بلحاظ اس پانی کے جسے وہ اٹھائے ہوئے ہوتی ہیں۔ کیونکہ اس پانی سے زندگی ملتی ہے اور اس کے مقابل پر ﴿الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ﴾ [الذاریات: 41:51] ''تباہ کرنے والی ہوا'' یا بانجھ ہوا وہ ہے جس میں پانی نہیں یا جس سے فائدہ نہیں پہنچتا بلکہ وہ عذاب کے رنگ میں ہوں۔ (ل)

خٰزِنِيْنَ۔ خَزَنٌ کے معنی ہیں ذخیرہ کے طور پر کسی چیز کی حفاظت کرنا، پھر عام طور پر حفاظت کرنا اس کے معنی ہو گئے ہیں اور اس سے پچھلی آیت میں جو ﴿عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ﴾ آیا ہے تو وہاں خَزَآئِنُ کے لفظ میں یہ اشارہ ہے کہ وہ اپنی قدرت سے جس چیز کو چاہتا ہے وجود میں لاتا ہے اور ﴿قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ﴾ [الأنعام: 50:6] ''کہہ دے، میں تم کو نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں۔'' میں خزائن سے مراد اس کی مقدورات ہیں یا اس کی جود اور اس کی قدرت۔ اور یہاں خازن کے معنی دو طرح پر ہو سکتے ہیں یعنی شکر کے ساتھ اس کی حفاظت کرنے والے یا یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی اسے بادلوں میں محفوظ کرتا ہے۔ جیسا دوسری جگہ ہے ﴿اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ۝﴾ [الواقعة: 56:68-69] ''کیا تم نے وہ پانی دیکھا، جو تم پیتے ہو۔ کیا تم اسے بادل سے اتارتے ہو یا ہم اتارنے والے ہیں۔'' (غ)

1683 - جس طرح پانی والی ہوائیں زندگی بخشتی ہیں اسی طرح وحی الٰہی بھی مردہ زمین کو زندہ کر دے گی اور جس طرح شہاب کی روشنی تاریکی کو دور کر دیتی ہے اسی طرح کہانت اور نجوم کی تاریکی قرآن شریف سے دور ہو جائے گی۔ اسی احیا اور اسی اماتت کی طرف یہاں اشارہ ہے۔

وَ لَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَ لَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ ﴿۲۴﴾

اور ہم تم میں سے آگے بڑھنے والوں کو خوب جانتے ہیں اور ہم پیچھے رہنے والوں کو بھی جانتے ہیں۔ (1684)

وَ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ ؕ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵﴾ ع 2 10 2

اور تیرا رب انہیں اکٹھا کرے گا، وہ حکمت والا علم والا ہے۔

وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۶﴾ ج

اور ہم نے انسان کو سوکھی ہوئی مٹی سے سیاہ کیچڑ سے جو متغیر ہو چکا ہو پیدا کیا۔ (1685)

1684 - ﴿الْمُسْتَقْدِمِيْنَ﴾۔ الْمُسْتَاْخِرِيْنَ سے پہلے گزرے ہوئے لوگ اور پیچھے آنے والے لوگ بھی مراد لیے گئے ہیں۔ اور نیکی میں قدم آگے رکھنے والے یا معصیت کر کے پیچھے رہنے والے بھی۔ (ج) اور سیاق عبارت پچھلے معنی کو صحیح ٹھہراتا ہے کیونکہ یہاں ذکر انہی لوگوں کا ہے جو خدا کی وحی سے زندگی حاصل کر کے قدم آگے رکھتے ہیں یا ظلمتوں اور تاریکیوں کی موت میں رہ کر زندگی کی اصل غرض کے حاصل کرنے میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔

1685 - صَلْصَالٍ۔ اصل میں آواز کے تردد کو کہتے ہیں جو خشک چیز سے پیدا ہو یعنی کھنکھنانا اور سوکھی ہوئی مٹی کو صَلْصَالٍ کہا جاتا ہے اور سڑی ہوئی مٹی کو بھی صَلْصَالٍ کہتے ہیں کیونکہ [صَلَّ اللَّحْمَ] کے معنی ہیں گوشت سڑ گیا یعنی بدبودار ہو گیا۔ (غ) اور مجاہد کہتے ہیں صَلْصَالٍ سے مراد ﴿حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ﴾ ہے یعنی سڑی ہوئی مٹی۔ (ل) مگر قرآن کریم میں دوسری جگہ ہے ﴿صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ﴾ [الرحمٰن: 14:55] ''ٹھیکری جیسی سوکھی ہوئی مٹی سے۔'' اس لیے پہلے معنی ہی درست ہیں کیونکہ فَخَّارٍ اُسے کہتے ہیں جو آگ میں پکائی گئی ہو۔

حَمَاٍ۔ حَمَاۃٌ اور حَمَا سیاہ سڑی ہوئی مٹی کو کہا جاتا ہے۔ جیسے کنوئیں کا سیاہ کیچڑ اور ﴿عَيْنٍ حَمِئَةٍ﴾ [الکھف: 86:18] سے مراد ذات حما یعنی سیاہ کیچڑ والا ہے اور حَمَا حَمَّاۃٌ کی جمع بھی ہے۔ (غ)

مَسْنُوْنٍ۔ سِنّ دانت کو کہتے ہیں ﴿السِّنَّ بِالسِّنِّ﴾ [المآئدۃ: 45:5] ''دانت کے بدلے دانت۔'' اور سَنَّ کے معنی صاف کیا اور صیقل کیا اور اسی سے سُنَّۃ منہ کو اس کی صفائی کی وجہ سے کہا جاتا ہے اور سَنّ کے معنی ایک چیز کو شکل وصورت دینا ہیں اور مسنون کے معنی مصور یعنی تصویر بنایا گیا ہیں اور یہاں مَسْنُوْنٌ کے معنی مُصَوَّرٌ صورت دیا گیا۔ اور مُنْتِنٌ بدبودار اور مُتَغَيِّر تبدیل شدہ کیے گئے ہیں۔ (ل) اور مفردات میں صرف متغیر اس کے معنی دیئے ہیں اور لسان العرب میں اخفش کا قول منقول ہے کہ یہ تغیر اس وقت واقع ہوتا ہے جب پانی جاری نہ ہو یعنی چلتے پانی میں یہ تغیر واقع نہیں ہوتا ٹھہرے ہوئے پانی میں ہوتا ہے۔

وَ الْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ﴿۲۷﴾ اور جنوں کو ہم نے (اس سے) پہلے تیز آگ سے پیدا کیا۔(1686)

ابتدائے پیدائش:

اس رکوع میں اصل مضمون تو شیطان کی انسان سے دشمنی ہے جو اسے ایک غلط راہ کی طرف لے جاتا ہے اور اس کے اعلیٰ قویٰ کی تکمیل میں روک ہوتا ہے اور اسے حصول مقصد زندگی میں ناکام رکھتا ہے۔ مگر ابتدا ہر دو کی پیدائش سے کی ہے۔ اور سب سے پہلے انسان کے اصل کی طرف توجہ دلائی ہے یا زندگی کی ابتدا کی طرف۔ کوئی سے بھی مدارج ہوں جن میں سے ہو کر انسان بنا اور کتنی بھی مدت اس کے بننے میں یا بننے پر گزر گئی ہو زندگی کی ابتدا کا جو کچھ پتہ آج سائنس سے ملتا ہے وہ وہی ہے جس کا ذکر یہاں دو تین لفظوں میں قرآن شریف نے کر دیا ہے۔ یعنی سب سے پہلی حالت زمین کی جو انسانی زندگی کی معاون ہوئی وہ صلصال تھی یا سوکھی ہوئی مٹی اور دوسری جگہ اسے ﴿صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ﴾ [الرحمٰن: 14:55] ''ٹھیکری جیسی سوکھی ہوئی مٹی سے'' کہہ کر بتا دیا کہ گویا وہ آگ سے پک کر نکلی ہے۔ اس میں یہ توجہ دلانا مقصود ہے کہ زمین کی موجودہ سطح گویا آگ سے پک کر تیار ہوئی ہے اور اسی کی شہادت آج سائنس سے ملتی ہے کہ ابتدا میں یہ زمین ایک آگ کا ٹکڑا تھا۔ تدریجاً ٹھنڈا ہوتے ہوتے اس کی اوپر کی سطح سخت ہوگئی۔ قرآن کریم نے اسے ﴿صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ﴾ [الرحمٰن: 14:55] کہہ کر اس کی حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے اور اگلی آیت میں اس کی ناری حالت کا ذکر بھی ان الفاظ میں کیا ہے کہ جنوں کو اس سے پہلے نار سے پیدا کیا۔ گویا اس سے پہلے پہلی حالت زمین کی نار تھی اور ناری صفت کے مطابق جو ہستیاں پیدا ہوئیں وہ جن ہیں۔ اور یہاں ﴿مِنْ صَلْصَالٍ﴾ کہہ کر پھر جو فرمایا ﴿مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ﴾ تو بتایا کہ صلصال کی حالت سے تبدیل ہو کر پھر حماء کی حالت ہوئی یعنی اس مٹی کے ساتھ پانی ملا اور پھر اس میں تغیر آیا اور سیدنا ابن عباس علیہ السلام سے ﴿مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ﴾ کے معنی [طِيْنَ رَطْبٍ] یعنی گیلی مٹی مروی ہیں۔ (ج) اور ابتدائے زندگی کی تاریخ پر جو روشنی سائنس نے ڈالی ہے وہ یہی ہے کہ زندگی کی ابتدا ایسی مٹی سے ہوتی ہے جس میں پانی مل کر اس میں ایک تغیر واقع ہو جائے۔ ایک امی کے منہ سے آج سے تیرہ سو سال پیشتر یہ الفاظ کہلوا کر اللہ تعالیٰ نے اپنے اس علم کا کامل ثبوت دیا ہے جس کے مقابل پر انسانی علوم ہیچ ہیں۔ اور صلصال میں چونکہ آواز کا خیال پایا جاتا ہے اور مسنون میں شکل وصورت دینے کا اس لیے ان الفاظ کے اختیار کرنے میں ساتھ ہی انسان کی ان دو صفات کی طرف بھی اشارہ ہے جو اسے دوسرے حیوانات سے متمیز کرتی ہیں۔ یعنی ایک گویائی اور دوسرے خاص قسم کی شکل وصورت۔

1686 - جَآنَّ۔ جِنّ کے لیے [دیکھو نمبر: 1015]۔ اور جَآنَّ کو بعض نے جنوں کا باپ کہا ہے جیسے آدم انسانوں کا باپ ہے اور بعض کے نزدیک جَآنّ جِنّ ہی ہیں اور یہ اسم جمع ہے اور بعض نے جَآنَّ کو جنوں کی ایک نوع قرار دیا ہے ﴿لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ۚ﴾ [الرحمٰن: 56:55] ''انہیں اس سے پہلے نہ کسی انسان نے ہاتھ لگایا اور نہ جن نے۔'' اور جان سانپ کی بھی ایک

وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۸﴾

اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں انسان کو سوکھی ہوئی مٹی سیاہ کیچڑ سے جو متغیر ہو چکا ہو پیدا کرنے والا ہوں۔

فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿۲۹﴾

سو جب میں اسے تکمیل کو پہنچاؤں اور اپنی روح اس میں پھونکوں تو تم اس کے لیے فرمانبرداری کرتے ہوئے گر پڑنا۔(1687)

قسم ہے جو پتلا ہلکا سا ہوتا ہے۔ ﴿كَاَنَّهَا جَآنٌّ﴾ [النمل: 10:27] ''گویا وہ چھوٹا سانپ ہے۔'' ﴿كَاَنَّهَا جَآنٌّ﴾ [القصص: 31:28] ''گویا وہ چھوٹا سانپ ہے۔'' اور جان شیطان کو بھی کہتے ہیں۔(ل)

﴿سَمُوْمٍ﴾۔ سَمّ اور سُمّ ہر ایک تنگ سوراخ کو کہتے ہیں جیسے سوئی کا ناکہ ﴿حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ﴾ [الأعراف: 40:7] ''جب تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل نہ ہوں گے۔'' اور اسی سے سَمَّ کے معنی داخل ہونا آتے ہیں اور سَمّ زہر کو کہتے ہیں کیونکہ وہ اپنی باریک تاثیر سے جسم میں داخل ہو جاتا ہے اور ﴿سَمُوْمٍ﴾ گرم ہوا کو کہتے ہیں کہ وہ بھی زہر کی طرح جسم پر اثر کرتی ہے ﴿فِيْ سَمُوْمٍ وَّ حَمِيْمٍ ۙ﴾ [الواقعة: 42:56] ''لو میں اور ابلتے ہوئے پانی میں۔'' ﴿وَ وَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ﴾ [الطور: 27:52] ''اور ہمیں لو کے عذاب سے بچالیا۔'' (غ) اور سَمُوْمٍ کے معنی ایسی گرم ہوا بھی کیے گئے ہیں جو قتل کر دے اور بعض نے اس کے معنی آگ کا شعلہ کیے ہیں اور یا اس کے معنی سخت تیز آگ کے ہیں۔(ج)

اس میں **زمین کی ابتدائی حالت** کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے یعنی نسل انسانی کی آبادی کے قابل ہونے سے پہلے **اس میں ایسی مخلوق تھی جو آگ سے پیدا ہوئی تھی** اور یہ کوئی بعید بات نہیں کہ جس قسم کے حالات ہوں اسی قسم کی مخلوق ہو۔ انسان کا خود خاص حالات میں پیدا ہونا بتاتا ہے کہ مختلف حالات کے لحاظ سے مختلف قسم کی مخلوق ہو سکتی ہے۔ محض یہ بات کہ ہمیں وہ ناری ہستیاں نظر نہیں آتیں ان کے وجود کے خلاف کوئی دلیل نہیں۔

1687 - سَوَّيْتُ۔ سَوَّيْتُهٗ، فَاسْتَوٰى اور اِسْتَوٰى کے معنی ہیں ایک چیز اپنے کمال کو پہنچ گئی۔ پس سَوّٰی کے معنی ہیں اس کو کمال کو پہنچایا۔ ﴿ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا﴾ [الكهف: 37:18] ''پھر تجھے پورا انسان بنایا۔'' ﴿الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى ۙ﴾ [الأعلیٰ: 2:87] ''جس نے پیدا کیا، پھر ٹھیک بنایا۔'' اور یہاں مراد جسمانی تسویہ ہے۔ نیز [دیکھو نمبر: 44]

رُوْحِيْ۔ ابن الانباری کا قول ہے کہ روح اور نفس ایک ہی ہیں سوائے اس کے کہ روح مذکر ہے اور نفس مؤنث۔(ت) اور نفس کے لیے [دیکھو نمبر: 598]۔ جہاں ایک معنی قوت ممیزہ بھی اس کے دیئے گئے ہیں اور روح کے معنی جان بھی آتے ہیں اور نفس

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴿۳۰﴾ پس کل فرشتوں سب کے سب نے فرمانبرداری کی۔

اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۳۱﴾ مگر ابلیس (نے نہ کی) اس نے انکار کیا کہ فرمانبرداری کرنے والوں کے ساتھ ہو۔

قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۳۲﴾ فرمایا اے ابلیس کیا وجہ ہے کہ تو فرمانبرداری کرنے والوں کے ساتھ نہیں ہوتا؟

قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۳۳﴾ اس نے کہا مجھ سے نہیں ہوسکتا کہ میں ایک انسان کی فرمانبرداری کروں جسے تو نے سوکھی ہوئی مٹی سے متغیر شدہ کیچڑ سے پیدا کیا ہے۔

قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ﴿۳۴﴾ کہا تو اس (حالت) سے نکل جا کیونکہ تو دور کیا گیا ہے۔

وَّ اِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۳۵﴾ اور تجھ پر قیامت کے دن تک لعنت ہے۔

بھی (یعنی نفس ناطقہ) اور وحی اور قرآن وغیرہ۔ (ل)

اللہ کی روح کا انسان میں نفخ:

روحی کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف سے برسبیل تشریف ہے جیسے بَيْتِيْ میں (غ) اور یہاں روح سے مراد نفس ناطقہ یا وہ چیز ہے جس سے انسان تمیز کرتا ہے۔ یہاں روح جان کے معنی میں اس لیے نہیں ہوسکتی کہ یہ روح انسان اور دوسرے حیوانات میں اشتراک رکھتی ہے اور سجدہ کا حکم کسی خصوصیت کی وجہ سے اگر جان کے ڈالا جانے کی وجہ سے یہ حکم ہوتا تو دوسرے جاندار بھی اس میں شامل ہوتے اور سورہ بقرہ میں اول انسان کو علم دیا جاتا ہے تب ملائکہ کو سجدہ کا حکم ہوتا ہے۔ اس سے بھی معلوم ہوا کہ یہاں نفخ روح سے مراد اس قوت ممیزہ کا نفخ ہے جس سے انسان علم حاصل کرتا ہے اور روح سے مراد وحی بھی نہیں ہوسکتی۔ اس لیے کہ یہ وہ روح ہے جو تمام انسانوں میں نفخ ہوتی ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ﴿ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۚ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَ نَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ﴾ [السجدۃ: 32:8-9] ''پھر اس کی نسل ایک نچوڑ سے ٹھہرائی (جو) کمزور پانی میں (آجاتا ہے)۔ پھر اسے ٹھیک بنایا اور اپنی روح اس میں پھونکی۔''

قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۳۶﴾

کہا میرے رب تو مجھے اس دن تک مہلت دے جس دن وہ اٹھائے جائیں گے۔

قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ﴿۳۷﴾

کہا تو ان میں سے ہے جنہیں مہلت دی گئی۔

اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ﴿۳۸﴾

ایک معلوم وقت کے دن تک۔ (1688)

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۳۹﴾

کہا میرے رب جیسا تو نے مجھے گمراہ ٹھہرایا میں انہیں زمین میں (نافرمانی کو) خوبصورت بنا کر دکھاؤں گا اور ان سب کو (حصول مقصد میں) ناکام رکھوں گا۔ (1689)

اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۴۰﴾

سوائے تیرے بندوں کے جو ان میں سے خالص کیے گئے ہیں۔

قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ ﴿۴۱﴾

فرمایا یہ سیدھا رستہ میری طرف ہے۔ (1690)

1688 - **جب تک اس دنیا پر انسان ہے اس وقت تک شیطان کا رہنا بھی ضروری ہے**۔ مگر اس کی بھی ذریت ہے اور ہر انسان کے لیے ایک علیحدہ شیطان کا ہونا حدیث سے بھی ثابت ہے: [كَانَ شَيْطَانُ اٰدَمَ كَافِرًا وَ شَيْطَانِيْ مُسْلِمًا]۔ دیکھو سورہ اعراف کا دوسرا رکوع۔

1689 - **دنیوی زندگی کو مقصد ٹھہرانا اصل حصول مقصد میں ناکامی ہے:** ﴿فِي الْاَرْضِ﴾ میں یہ اشارہ ہے کہ دنیا کی زندگی انہیں اچھی کر کے دکھاؤں گا یہاں تک کہ وہ اس دنیوی زندگی کو ہی اپنا مقصد بنالیں۔ اس لیے آخر پر ﴿لَاُغْوِيَنَّهُمْ﴾ کا لفظ استعمال کیا ہے اور غَيٌّ کے معنی وہ جہالت ہیں جو اعتقاد فاسد سے پیدا ہو اور غَوٰی کے معنی خَابَ یعنی ناکام ہوا اور اِغْوَا کے معنی ناکام رکھنا ہیں۔ [دیکھو نمبر: 1085]۔ یعنی اصل مقصد زندگی کی طرف ان کی توجہ نہ ہونے دوں گا اور یوں انہیں اس مقصد کے حصول میں ناکام رکھوں گا۔

1690 - یہاں عَلَيَّ بمعنی اِلَيَّ ہے۔ (ج) یعنی مجھ تک پہنچانے والا یہ صراط مستقیم ہے اور یا عَلَيَّ کے معنی ہیں میں اسے ضرور ملحوظ رکھوں گا۔

اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِیْنَ ﴿۴۲﴾

کہ میرے بندوں پر تیرا کوئی غلبہ نہیں مگر جو جاہلوں میں سے تیرے پیچھے چلے۔ (1691)

وَ اِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِیْنَ ﴿۴۳﴾ۙ

اور یقیناً ان سب کے وعدہ کی جگہ دوزخ ہے۔

لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ ؕ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ ﴿۴۴﴾ ع 3 19 3

اس کے سات دروازے ہیں، ہر ایک دروازے کے لیے ان میں سے ایک حصہ الگ کر دیا گیا ہے۔ (1692)

1691 - عِبَادَ یَا عَبْدٌ کے لیے [دیکھو نمبر: 284]۔ عِبَادِیْ سے مراد یہاں عموماً وہی ﴿عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِیْنَ ۝﴾ لیے گئے ہیں جن کا ذکر [آیت نمبر: 40] میں ہے۔ مگر قرینہ یہ چاہتا ہے کہ یہاں لفظ عام ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عباد مخلصین سے تو شیطان خود ہی مایوس ہے کیونکہ ان کو اللہ تعالیٰ نے پہلے سے ہی شیطان کی غلامی سے آزاد کر رکھا ہے۔ اس لیے وہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں انہیں چھوڑ کر باقی سب کو ناکام کر دوں گا یعنی دنیا ہی ان کا مقصد ہو جائے گی اور وہ اصل مقصد زندگی کے حاصل کرنے میں ناکام رہیں گے۔ تو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تمہارا تسلط اور غلبہ تو کسی بندہ پر بھی نہ ہوگا۔ ہاں جو خود بخود اپنے فاسد اعتقاد کی وجہ سے جاہل رہ کر تیری پیروی کرے تو کرے۔ یہ آیت اس بات پر قطعی شہادت ہے کہ شیطان کا بندوں پر تسلط کوئی نہیں، وہ خود اس کے پیچھے لگتے ہیں۔

1692 - اَبْوَابٍ۔ بَابٌ کی جمع ہے۔ کسی چیز میں داخل ہونے کا راستہ۔ اور اصل میں مکانوں میں داخل ہونے کا رستہ ہے اور ایک علم کو دوسرے علم کا باب کہا جاتا ہے۔ یعنی اس کے ذریعہ سے اس دوسرے علم تک پہنچا جاتا ہے۔

علیؓ بابِ علم ہیں:

[اَنَا مَدِیْنَةُ الْعِلْمَ وَعَلِیٌّ بَابُهَا] (معرفة الصحابة لأبی نعیم، جلد1، صفحہ372، حدیث:330) (میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہے) پس بَابٌ سے مراد یہی ہے کہ اس کے ذریعہ مجھ تک پہنچ سکتے ہو اور یہ کوئی خصوصیت نہیں۔ بلکہ جیسا کہ دوسری حدیث میں ہے [اَصْحَابِیْ كَالنُّجُوْمُ بِاَیِّهِمُ اقْتَدَیْتُمْ اِهْتَدَیْتُمْ] (جامع الاصول فی احادیث الرسول، جلد8، صفحہ556، حدیث:6369) میرے اصحاب ستاروں کی طرح ہیں جس کی پیروی کرو گے ہدایت پالو گے۔ مراد صرف یہ ہے کہ صحابہ مثل دروازوں کے ہیں اور حقیقی علم صرف رسول اللہ ﷺ ہی ہیں۔ اسی لیے صحابی کا قول حجت شرعی نہیں۔ اور ﴿فَتَحْنَا عَلَیْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَیْءٍ﴾ [الأنعام: 44:6] ''ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے۔'' میں بھی ذرائع ہی مراد ہیں۔ اور [اَبْوَابُ الْجَنَّةِ] اور ﴿اَبْوَابَ جَهَنَّمَ﴾ میں مراد وہ باتیں ہیں جن کے ذریعہ سے ان تک پہنچا جاتا ہے۔ (غ) اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ﴿اَبْوَابَ جَهَنَّمَ﴾ سے مراد **طبقات جہنم** ہیں نہ دروازے۔ (ج) اور ان سات

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ﴿۴۵﴾

متقی باغوں اور چشموں میں رہیں گے۔

اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيْنَ ﴿۴۶﴾

ان میں سلامتی سے امن کی حالت میں داخل ہو جاؤ۔

وَ نَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ﴿۴۷﴾

اور جو ان کے دلوں میں کچھ کدورت ہوگی ہم اسے نکال دیں گے۔ وہ بھائی بھائی تختوں پر آمنے سامنے ہوں گے۔ (1693)

طبقوں کے نام [جَهَنَّمَ، لَظٰى، حُطَمَةُ، سَعِيْرٍ، سَقَرَ، جَحِيْمٍ، هَاوِيَةٌ] لیے گئے ہیں۔ (ج) اور قرآن شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساتوں دوزخ کے مختلف نام ہیں اور ہر ایک ان میں سے کسی وصف کے لحاظ سے دوزخ کا نام ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ سات کا استعمال ایسی حالت میں عدد کامل کے طور پر ہو۔ یعنی بہت سے دروازے۔ سَبْعَةُ کے لیے [دیکھو نمبر: 44]۔ اور قتادہ کہتے ہیں کہ یہ سات دروازے ان کے اعمال کے مطابق سات منزلیں ہیں۔ (ج) اور یہی اصل حقیقت ہے کہ ہر ایک شخص کا دوزخ اس کے اعمال کے مطابق ہے۔ کسی موٹی تقسیم کے لحاظ سے ان کی سات قسمیں بھی ہو سکتی ہیں۔

1693 - سُرُرٍ۔ سَرِيْرٌ کی جمع ہے اور مادہ اس کا سِرّ ہے جس کے معنی بھید یا چھپی ہوئی چیز ہیں اور سُرُوْرٌ خوشی کو کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے کہ وہ چھپی ہوتی ہے اور سَرِيْرٌ تخت کو کہتے ہیں اس لیے کہ اس پر سرور کے ساتھ بیٹھتے ہیں اور یہ صرف اہل نعمت کے لیے ہے اور جس پر میت کو رکھا جائے اسے بھی سَرِيْرٌ کہا جاتا ہے اس لیے کہ اس میں خوشی کا تفاول ہے جو موت کے بعد ملے گی اور دنیا کے غموں سے نجات ہے۔ (غ)

چونکہ پچھلے رکوع میں شیطان کا ذکر تھا اور ان لوگوں کے انجام کا جو اس کی اتباع کرتے ہیں اس لیے یہاں تقابل کے طور پر ان لوگوں کا ذکر کیا ہے جو شیطان کے اتباع سے اپنے آپ کو بچاتے ہیں۔ یعنی متقی، متبعین شیطان یا حیوانی زندگی کو مقصد بنا لینے والے کے لیے اگر آخر کار آگ ہے تو متقی کے لیے جنت ہے۔ اس **جنت کا نقشہ** یہاں جن الفاظ میں کھینچا ہے اس کی طرف کم لوگ توجہ کرتے ہیں۔ انسان کے اپنے نفس کے لیے وہاں ہر قسم کے عیوب سے سلامتی ہے اور ہر قسم کے خطرات سے امن ہے۔ پھر دوسروں سے بھی تعلقات ہیں اور وہ تعلقات اس اعلیٰ درجہ کی محبت کے ہیں جو اخوت کے نام سے موسوم ہیں۔ مگر اخوت بھی ایسی جس میں رنج وحسد کوئی نہیں، جس سے دنیا کی محبتیں اور اخوتیں عموماً آلودہ رہتی ہیں۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ ان نعمتوں کا دوام ہے یعنی ان سے کبھی کوئی نکالا نہیں جائے گا۔ جو بلا یہاں دنیا کی نعمتوں سے لگی ہوئی ہے کہ آج ایک شخص کو ملتی ہے تو کل ان سے محروم ہو جاتا ہے۔ مگر ایک چیز کی مداومت سے انسان تھک جاتا ہے۔ اس لیے فرمایا کہ یہ مداومت ایسی نہ ہوگی جس میں تکان ہو۔ یہ کمال راحت کا نقشہ ہے جس سے بڑھ کر راحت کے لیے اور الفاظ تجویز نہیں ہو سکتے۔ اور متقی کو جو اس دنیا میں جنت ملتی ہے اس میں بھی یہ سب کیفیات ایک نہ ایک رنگ میں موجود ہوتی ہیں ﴿فِيْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْنٍ ﴿۴۵﴾﴾ یعنی باغوں

لَا يَمَسُّهُمْ فِيْهَا نَصَبٌ وَّ مَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ ﴿۴۸﴾

انہیں ان میں کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی اور نہ وہ وہاں سے نکالے جائیں گے۔

نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۴۹﴾

میرے بندوں کو خبر دے دو کہ میں بخشنے والا رحم کرنے والا ہوں۔

وَ اَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ﴿۵۰﴾

اور کہ میرا عذاب دردناک عذاب ہے۔ (1694)

وقف لازم

وَ نَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ ﴿۵۱﴾

اور انہیں ابراہیم کے مہمانوں کی خبر دے دو۔

اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ اِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُوْنَ ﴿۵۲﴾

جب وہ اس کے پاس آئے تو کہا سلامتی ہو۔ اس نے کہا ہم تم سے ڈرتے ہیں۔

قَالُوْا لَا تَوْجَلْ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴿۵۳﴾

انہوں نے کہا ڈر نہیں ہم تجھے ایک صاحب علم لڑکے کی خوشخبری دیتے ہیں۔

قَالَ اَبَشَّرْتُمُوْنِيْ عَلٰٓى اَنْ مَّسَّنِيَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوْنَ ﴿۵۴﴾

اس نے کہا کیا تم مجھے خوشخبری دیتے ہو حالانکہ مجھے بڑھاپے نے آلیا ہے تو تم کاہے کی خوش خبری دیتے ہو۔

اور چشموں میں ہوں گے اور دوسری جگہ فرمایا ﴿فِيْ جَنّٰتٍ وَّ نَهَرٍ﴾ [القمر: 54:54] باغوں اور نہر میں ہوں گے۔ جس سے معلوم ہوا کہ یہ چشمے اور نہریں ایسی ہیں کہ ان میں انسان رہ بھی سکتا ہے۔

1694 - جب دونوں راہیں بتادیں تو ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی ان دو صفات کی طرف بھی اشارہ کیا یعنی ایک طرف غفور رحم اور دوسری طرف سزا دینے کی صفت۔ کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ ان دونوں باتوں پر اس کا ایمان نہ ہو۔ **اسی رجاء وخوف کے درمیان ایمان ہے** کہ اس کی رحمت بھی بہت وسیع ہے مگر اس کی سزا بھی سخت ہے اور آگے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کے ذکر میں یہی دو نقشے پیش کیے ہیں۔

قَالُوْا بَشَّرْنٰكَ بِالْحَقِّ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقٰنِطِيْنَ ﴿۵۵﴾

انہوں نے کہا ہم حق کے ساتھ تجھے خوشخبری دیتے ہیں۔ پس تو ناامیدوں میں سے نہ ہو۔ (1695)

قَالَ وَ مَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ﴿۵۶﴾

اس نے کہا اور سوائے گمراہوں کے اپنے رب کی رحمت سے کون مایوس ہوسکتا ہے۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۵۷﴾

کہا، تو اے رسولو! تمہارا کام کیا ہے؟

قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ﴿۵۸﴾

انہوں نے کہا، ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔

اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ؕ اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۹﴾

سوائے لوط کے پیروؤں کے ہم ان سب کو ضرور بچالیں گے۔

اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۙ قَدَّرْنَآ ۙ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۶۰﴾ ع 4 16 4

مگر اس کی عورت ہم مقدر کر چکے ہیں کہ وہ پیچھے رہنے والوں میں سے ہو۔ (1696)

1695 - يَّقْنَطُ۔ قَنُوْطٌ کے معنی بھلائی سے مایوس ہوجانا ہیں اور قٰنِطٍ اور ﴿قَنُوْطٌ﴾ [حم السجدة: 49:41] مایوس ہونے والا ہے۔ (غ)

یہاں انہی واقعات کا ذکر ہے جو سورۂ ہود میں [آیت نمبر: 69-73] میں بیان ہو چکے ہیں۔ **یہاں ان آنے والوں کو مہمان کہا ہے۔ اس سے بھی پتہ لگتا ہے کہ یہ انسان تھے** اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ کہنا کہ تم کس ذریعہ سے مجھے خوشخبری دیتے ہو صاف بتاتا ہے کہ وہ انہیں ملائکہ نہ سمجھتے تھے۔ اور یہ ناممکن ہے کہ فرشتہ نبی پر نازل ہو تو وہ اسے شناخت نہ کرے کہ یہ فرشتہ ہے اور ان کا جواب کہ ہم تجھے حق کے ساتھ خوشخبری دیتے ہیں، اسی بات کا مؤید ہے۔ گویا وہ بتاتے ہیں کہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی سے آگاہ کیا ہے جو امر حق ہے۔

1696 - ﴿اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ﴾ میں الا استثنائے منقطع ہے اور مطلب صرف اس قدر ہے کہ آل لوط اس مجرم قوم میں داخل نہیں اور اگلے رکوع کی پہلی آیت میں صاف فرمایا کہ رسول آل لوط کے پاس آئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کے اس واقعہ کو اکٹھا بیان کرنے پر [دیکھو نمبر: 1480]۔ قَدَّرْنَا میں ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف جاتی ہے کیونکہ قضاء وقدر نہ ملائکہ کے اختیار میں ہے نہ انسانوں کے۔ بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور اس میں کوئی بُعد نہیں کہ ان مرسلوں کے کلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا کلام شروع ہوگیا ہو۔ دوسری جگہ انہی مرسلوں کا کلام یوں نقل کیا ہے ﴿قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ۙ لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ

فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوْطِ ِۨالْمُرْسَلُوْنَ ۝۶۱ | سوجب رسول لوط کی آل کے پاس آئے۔

قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ۝۶۲ | انہوں نے کہا تم اجنبی لوگ ہو۔

قَالُوْا بَلْ جِئْنٰكَ بِمَا كَانُوْا فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ۝۶۳ | انہوں نے کہا بلکہ ہم وہ بات تیرے پاس لائے ہیں جس میں یہ جھگڑتے تھے

وَ اَتَيْنٰكَ بِالْحَقِّ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۝۶۴ | اور ہم حق کے ساتھ تیرے پاس آئے ہیں اور یقیناً ہم سچے ہیں۔ (1697)

حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ ۝۳۳ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ ۝۳۴ فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۳۵ فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝۳۶ وَ تَرَكْنَا فِيْهَاۤ اٰيَةً لِّلَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ۝۳۷﴾[الذاریات: 51:32-37] ''انہوں نے کہا، ہم ایک مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ تاکہ ان پر مٹی کے پتھر برسائیں۔ (جن پر) تیرے رب کے ہاں حد سے بڑھ جانے والوں کے لیے نشان کیے گئے ہیں۔ سو ہم نے ان کو جو اس میں مومن تھے نکال دیا۔ پر ہم نے اس میں سوائے مسلموں کے ایک گھر کے اور کسی کو نہ پایا۔ اور ہم نے اس میں ان لوگوں کے لیے نشان چھوڑا جو دردناک عذاب سے ڈرتے ہیں۔'' جس میں لازماً کہیں نہ کہیں ضمیر کو بدل کر اللہ تعالیٰ کی طرف لانا پڑتا ہے۔ کیونکہ آخری الفاظ تَرَكْنَا کسی طرح ان ملائکہ کی طرف منسوب نہیں ہو سکتے۔ اور اس موقعہ پر تفاسیر میں ﴿فَاَخْرَجْنَا﴾ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکایۃً قول مانا گیا ہے۔ اسی طرح یہاں ﴿اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ﴾ سے کلام حکایۃً اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔

1697 - **حضرت لوط علیہ السلام نے بھی ان مرسلوں کو انسان ہی سمجھا:** جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان آنے والوں کو ملائکہ نہیں سمجھا، حضرت لوط علیہ السلام نے بھی نہیں سمجھا۔ کیونکہ نبی ملائکہ کو منکر یا اجنبی لوگ نہیں کہہ سکتا اور ان کا حضرت لوط علیہ السلام کو یقین دلانا کہ ہم سچے ہیں، صاف بتاتا ہے کہ یہ انسان تھے۔ فرشتوں کو ایسا یقین دلانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ﴿اَتَيْنٰكَ بِالْحَقِّ﴾ کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ ایک حق بات ہم آپ کے پاس لائے ہیں یعنی عذاب الٰہی جس کا آنا حق ہے۔ مگر یہ خطاب حضرت لوط علیہ السلام کے لیے موزوں نہیں، ان کی قوم کے لیے موزوں ہو سکتا ہے۔ اس لیے میں نے دوسرے معنی اختیار کیے ہیں کہ ہم اقتضائے حکمت کے مطابق آپ کے پاس آئے ہیں تاکہ اس قوم پر اتمام حجت ہو جائے اور یہ اپنی شرارت کو اس انتہا تک پہنچا دیں جس کے بعد قوم کو مہلت نہیں دی جاتی۔ یہاں جن واقعات کا ذکر ہے وہی سورہ ہود کے ساتویں رکوع میں بیان ہو چکے ہیں۔ [دیکھو نمبر: 1486] سے [نمبر: 1491] تک۔

فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَ اتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ وَ لَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ وَّ امْضُوْا حَيْثُ تُؤْمَرُوْنَ ﴿۶۵﴾

سو اپنے اہل کو کچھ رات رہے لے کر چلا جا اور خود ان کے پیچھے چل اور تم میں سے کوئی شخص پیچھے مڑ کر نہ دیکھے اور چلے جاؤ جہاں تمہیں حکم دیا گیا ہے۔ (1698)

وَ قَضَيْنَاۤ اِلَيْهِ ذٰلِكَ الْاَمْرَ اَنَّ دَابِرَ هٰۤؤُلَاۤءِ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِيْنَ ﴿۶۶﴾

اور ہم نے اس کے ساتھ اس بات کا فیصلہ کر دیا کہ ان کی جڑ صبح ہوتے کی کاٹ دی جائے گی۔ (1699)

وَ جَآءَ اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۶۷﴾

اور شہر کے لوگ خوش خوش آئے۔

قَالَ اِنَّ هٰۤؤُلَاۤءِ ضَيْفِيْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ ﴿۶۸﴾

(لوط نے) کہا یہ میرے مہمان ہیں تو تم مجھے رسوا نہ کرو۔ (1700)

1698 - خود ان کے پیچھے چلو۔ یہی انبیاء کی طرز ہے۔ سب سے بڑھ کر خطرے کے مقام میں خود رہتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے بھی سب صحابہ کو مکہ سے رخصت کر کے سب سے آخر خود ہجرت کی، تاکہ کمزور ناتواں وغیرہ پیچھے نہ رہ جائیں۔ پیچھے مڑ کر نہ دیکھنے کی تاکید اس لیے کی کہ وہ ایک خطرناک مقام تھا۔ ایسا نہ ہو کہ نکل کر اس انتظار میں ٹھہر جائیں کہ اس قوم پر کیا سزا آتی ہے۔ اور جہاں حکم دیا جاتا ہے وہاں چلے جاؤ۔ یہ حکم الٰہی حضرت لوط علیہ السلام کو علیحدہ دیا گیا اور ہوسکتا ہے کہ یہ سارا کلام ﴿فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ﴾ سے لے کر حضرت لوط علیہ السلام کی طرف وحی ہے۔ جیسا کہ اسی آیت میں اس وحی کا صاف ذکر بھی ہے۔

1699 - قَضَيْنَاۤ۔ قَضَا کے معنی فصل امر یعنی ایک بات کا قطعی فیصلہ کر دینا ہیں اور جہاں وحی الٰہی سے ایک امر کا قطعی فیصلہ کر دیا جائے اس پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جیسے یہاں اور ﴿وَ قَضَيْنَاۤ اِلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ﴾ [بنی إسرائیل: 4:17] ''اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب میں یقینی خبر دے دی تھی۔'' میں بھی یہی قضاء بالا علام مراد ہے یعنی ایک بات کا قطعی خبر سے علم دے دینا۔ (غ)

اس سے معلوم ہوا کہ ان رسولوں کا آنا اور وحی الٰہی دو الگ الگ امر ہیں۔ اگر یہ رسول فرشتے ہوتے تو علیحدہ وحی کی ضرورت نہ تھی۔ بلکہ فرشتوں کا آنا ہی کافی تھا۔ مگر چونکہ رسول اپنی وحی پر ہی عمل کرتے ہیں اس لیے حضرت لوط علیہ السلام کی طرف وحی بھی ہوئی۔

1700 - ﴿تَفْضَحُوْنِ﴾۔ فَضَحَ کے معنی (جس سے فضیحت ہے) کسی برائی کی تشہیر ہے۔

وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ لَا تُخْزُوْنِ ﴿۶۹﴾

اور اللہ کا تقویٰ کرو اور مجھے ذلیل نہ کرو۔

قَالُوْۤا اَوَ لَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۰﴾

انہوں نے کہا کیا ہم نے تمہیں جہان (کے لوگوں) سے روکا نہیں۔ (1701)

قَالَ هٰۤؤُلَآءِ بَنٰتِيْۤ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴿۷۱﴾

کہا یہ میری بیٹیاں ہیں اگر تم (ان سے نکاح) کرنا چاہتے ہو۔

لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۷۲﴾

تیری زندگی کی قسم وہ اپنی بدمستی میں اندھے ہو رہے تھے۔ (1702)

1701 - [پیدائش: 9:19] میں ہے ''یہ ایک مرد یہاں گزران کرنے آیا'' مطلب یہ ہے کہ ہماری قوم میں سے نہیں۔ معلوم ہوتا ہے اسی وجہ سے انہوں نے حضرت لوط علیہ السلام کو اس بات سے روک دیا تھا کہ آپ کے پاس کوئی مہمان آ کر رہے یعنی کوئی غیر قوم کا آدمی آ کر ٹھہرے۔ یہی مطلب ان الفاظ کا ہے۔

1702 - ﴿لَعَمْرُكَ﴾۔ عَمَرٌ اور عُمُرٌ کے ایک ہی معنی ہیں [دیکھو نمبر: 121]۔ قسم میں عَمَرٌ کا لفظ آتا ہے۔ یہاں قسم کھانے والا کون ہے اور کس چیز کی قسم ہے۔ اکثر اس طرف گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کی زندگی کی قسم کھائی ہے اور بعض کے نزدیک حضرت لوط علیہ السلام کے مہمانوں نے لوط کی زندگی کی قسم کھائی ہے۔ اور گو اس میں قَالُوْا محذوف ماننا پڑے گا مگر قرینہ اسی کو چاہتا ہے۔ اور اس طرح پر حذف قرآن شریف میں کئی جگہ آتا ہے اور یہاں ذکر قوم لوط کا ہی ہے۔ پہلی صورت میں آنحضرت ﷺ کی زندگی کی قسم کھانے سے کیا منشا ہے۔ **انسان جب خدا کی قسم کھاتا ہے تو اس کا منشا عموماً یہ ہوتا ہے** کہ وہ اللہ تعالیٰ کو اس بات پر گواہ ٹھہراتا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کی قسم میں مراد صرف اس قدر ہوگی کہ کسی چیز کو بطور گواہ پیش کیا جاتا ہے۔ تو اس صورت میں نبی کریم ﷺ کی زندگی کو بطور گواہ پیش کیا ہے اور یہ سچ ہے کہ ایک راستباز، ہاں تمام راستبازوں کے سردار کی زندگی ان لوگوں کے اندھا اور بدمست ہونے پر گواہ ہے جو بدی میں منہمک ہو جاتے ہیں۔ اور لسان العرب میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اس قول کو نقل کر کے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں نبی کریم ﷺ کی زندگی کی قسم کھائی ہے اور آپ کے سوائے اور کسی کی زندگی کی قسم نہیں کھائی اس کا انکار بھی نقل کیا ہے اور لکھا ہے کہ دوسروں نے اس کے معنی کیے ہیں [لَدِيْنُكَ الَّذِيْ تَعْمُرُ] یعنی تیرے اس دین کی قسم جسے تو مروج کرتا ہے۔ (ل)

فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِيْنَ ﴿۷۳﴾

سو ایک خطرناک آواز نے انہیں سورج نکلتے ہی آ پکڑا۔[1703]

فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ﴿۷۴﴾

پس ہم نے اسے تہ و بالا کر دیا اور ہم نے ان پر سخت پتھر برسائے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ ﴿۷۵﴾

یقیناً اس میں فراست والوں کے لیے نشان ہیں۔[1704]

وَ اِنَّهَا لَبِسَبِيْلٍ مُّقِيْمٍ ﴿۷۶﴾

اور وہ (شہر) ایک دائمی رستے پر ہے۔[1705]

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۷۷﴾

یقیناً اس میں مومنوں کے لیے نشان ہیں۔

وَ اِنْ كَانَ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ لَظٰلِمِيْنَ ﴿۷۸﴾

اور بَن کے رہنے والے بھی ظالم تھے۔[1706]

1703 - ﴿مُشْرِقِيْنَ﴾۔ [شَرَقَتِ الشَّمْسُ] کے معنی ہیں سورج طلوع ہوا اور اَشرَقَ کے معنی روشن کر دیا ﴿بِالْعَشِيِّ وَ الْاِشْرَاقِ﴾ [صٓ: 18:38] ''شام اور دن چڑھے۔'' اور مَشْرِقٌ جدھر سے سورج طلوع ہوتا ہے ﴿مَكَانًا شَرْقِيًّا﴾ [مریم: 16:19] ''مشرقی مکان میں۔''

1704 - ﴿مُتَوَسِّمِيْنَ﴾۔ وَسَمٌ کے معنی نشان کرنا ہیں اور سِمَةٌ نشان ہے۔ یہی معنی سِيْمَا کے ہیں ﴿سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ﴾ [الفتح: 29:48] ''ان کا نشان اُن کے مونہوں پر ہے۔'' ﴿تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ﴾ [البقرۃ: 273:2] ''تو انہیں ان کی نشانیوں سے پہچان لے گا۔'' (اور یہاں فا کی جگہ عین نے لے لی ہے) اور وَسَمٌ یَسِمُ کے معنی ہیں کسی نشان لگانے والی چیز کے ساتھ نشان لگایا ﴿سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ ۝﴾ [القلم: 16:68] ''ہم ان کی ناک پر داغ لگائیں گے۔'' اور تُوُسِّمَ کے معنی فَرَاسَتٌ یا فَطَنْتُ ہیں اور مَتَوَسِّم وہ ہے جو عبرت حاصل کرے یا فراست سے کام لے۔ (غ)

1705 - ﴿مُّقِيْمٍ﴾۔ اِقَامَةٌ کے معنی دوام بھی آتے ہیں یعنی ہمیشہ رہنا جیسے ﴿عَذَابٌ مُّقِيْمٌ﴾ [المآئدۃ: 37:5] ''قائم رہنے والا عذاب ہے۔'' (غ) یہاں مراد دائمی رستہ ہے۔

مراد یہ ہے کہ لوط کی یہ بستیاں ایک ایسے رستہ پر ہیں جو ہمیشہ چلتا ہے۔ اس لیے یہ تباہ شدہ بستیاں بھی نظروں کے سامنے آتی رہتی ہیں۔ آج بھی یہ رستہ اسی طرح جاری ہے۔

1706 - اَيْكَةٌ۔ بہت سے درختوں کو کہتے ہیں جو ایک دوسرے میں پھنسے ہوئے ہوں۔ اور ایسی جگہ کو بھی کہتے ہیں جہاں اس

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ ۘ وَ اِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ ﴿٧٩﴾ — سو ہم نے انہیں سزا دی اور یہ دونوں (شہر) کھلے رستے پر ہیں۔ (1707)

وَ لَقَدْ كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٨٠﴾ — اور حجر کے رہنے والوں نے رسولوں کو جھٹلایا۔ (1708)

طرح درخت ہوں یعنی بن کو۔ (ل) اور ﴿ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ ﴾ یا تو بن کے رہنے والے تھے یا ایک شہر کا نام ہے۔

﴿ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ ﴾ کون تھے؟ ان کا ذکر یہاں اور [صٓ: 13:38] میں اور [قٓ: 13:50] میں قوم لوط کے ساتھ مجملاً آیا ہے اور [الشعرآء: 26:176-191] میں قوم لوط کے بعد ان کا ذکر مفصل آیا ہے۔ جہاں یہ ذکر ہے کہ ان کے رسول حضرت شعیب علیہ السلام تھے اور حضرت شعیب علیہ السلام کا اہل مدین کی طرف مبعوث ہونا دوسری جگہ سے ظاہر ہے ﴿ وَ اِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ﴾ [الأعراف: 85:7] ''اور مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو (بھیجا)۔'' پس سوال یہ ہے کہ آیا یہ ایک ہی قوم کے دو نام ہیں یا دو الگ الگ قومیں ہیں۔ اہل مدین کے عذاب کو [هود: 94:11] میں صَيْحَةٌ کہا ہے اور ﴿ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ ﴾ کے عذاب کو [الشعرآء: 189:26] میں ﴿ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ ﴾ ''بادل والے دن کے عذاب نے۔'' کہا ہے۔ اس سے اور ایک حدیث سے جو ابن عساکر میں مذکور ہے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ یہ دو الگ الگ قومیں تھیں۔ مگر علاوہ اس بات کے جس کا ذکر اوپر ہوا کہ دونوں قوموں کی بیماری ایک ہے۔ قرآن شریف میں جہاں اہل مدین کا ذکر ہے وہاں ﴿ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ ﴾ کا نہیں اور جہاں ﴿ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ ﴾ کا ہے وہاں اہل مدین کا نہیں۔ جس سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ یہ ایک ہی قوم ہے۔ اور عذاب کے دو نام آنے سے یہ قیاس کرنا کہ الگ الگ عذاب تھے بالکل غلط ہے۔ صَيْحَةٌ زلزلہ کو کہا ہے اور زلزلہ جس میں آتش فشاں کی سنگ باری ہو ﴿ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ ﴾ کہلا سکتا ہے۔ پس یا یہ ایک ہی قوم ہے اور یا ایک ہی قوم کے دو ٹکڑے ہیں۔

1707 - اِمَامٍ کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 155]۔ چونکہ رستہ پر چلا جاتا ہے اس لیے اسے بھی امام کہہ دیا ہے۔

دونوں سے مراد لوط علیہ السلام اور شعیب علیہ السلام کی بستیاں ہیں۔ کیونکہ یہ دونوں ایک ہی رستہ پر واقع ہیں۔

1708 - الْحِجْرِ قوم ثمود کے مسکن کا نام ہے۔ (غ) اور یہ قطعہ مدینہ کے شمال میں ملک عرب کی حدود کے اندر واقع ہے۔

یہاں قوم ثمود کا ذکر ہے اس سے پہلے قوم لوط اور پھر قوم شعیب کا ذکر کیا تھا۔ ان تین کو یہاں ذکر سے کیوں مخصوص کیا۔ اور پھر یہ ترتیب کیسی ہے کہ لوط کی قوم ثمود کے بعد ہوئی اور شعیب کا زمانہ لوط سے بعد ہے۔ لیکن یہاں ذکر اول لوط کا پھر قوم شعیب کا پھر قوم ثمود کا ہے۔ بات یہ ہے کہ ان تینوں قوموں کے مسکن اس رستہ پر ہیں جہاں سے اہل مکہ اپنی شام کی تجارت میں بار بار گزرتے تھے۔ اس لیے انہی تین کو یہاں ذکر سے مخصوص کیا ہے۔ اور ترتیب اس لحاظ سے ہے کہ سب سے اوپر لوط کی بستیاں ہیں اس سے نیچے قوم شعیب کی اور اس کے نیچے وادی حجر ہے۔ یعنی قوم ثمود کا مسکن۔ ان کا ذکر اعدائے اسلام کی عبرت

وَ اٰتَيْنٰهُمْ اٰيٰتِنَا فَكَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ﴿۸۱﴾

اور ہم نے انہیں اپنی آیتیں دیں تو وہ ان سے منہ پھیر لینے والے ہوئے۔

وَ كَانُوْا يَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا اٰمِنِيْنَ ﴿۸۲﴾

اور وہ امن میں پہاڑوں کو تراش کر گھر بناتے تھے۔

فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِيْنَ ﴿۸۳﴾

سو صبح ہوتے ہی انہیں سخت آواز نے آلیا۔

فَمَاۤ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۸۴﴾

پس جو کچھ وہ کماتے تھے ان کے کسی کام نہ آیا۔

وَ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَيْنَهُمَاۤ اِلَّا بِالْحَقِّ ؕ وَ اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ ﴿۸۵﴾

اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے حق کے ساتھ ہی پیدا کیا ہے اور یقیناً (موعود) گھڑی آنے والی ہے۔ سو خوبی سے درگزر کرتے رہو۔ (1709)

کے لیے کیا۔ نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کو فرمایا کہ ان تباہ شدہ مقاموں پر جائیں تو روتے ہوئے جائیں۔ مطلب یہ ہے کہ عبرت حاصل کریں۔ (بخاری) خود مدت بعد تبوک کو جاتے ہوئے صحابہ کو اسی طرح نصیحت فرمائی۔ معلوم ہوتا ہے یہ قوم قبول حق میں بہت ہی سخت تھی شاید اسی موزونیت سے سورۃ کا نام الحجر ہے۔

1709 - ﴿الْجَمِيْلَ﴾۔ جَمَال حسن کثیر کو کہتے ہیں اور یہ دو قسم ہے۔ ایک وہ جو انسان سے مخصوص ہے، اس کے نفس میں ہو یا بدن میں یا فعل میں اور دوسرا وہ جو اس کے غیر کی طرف پہنچتا ہے۔ اور یہی معنی ہیں اس حدیث کے [إِنَّ اللهَ جَمِيلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ] (صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب تَحْرِيمِ الْكِبْرِ وَبَيَانِهِ، حديث:275) اللہ جمیل ہے جمال سے محبت کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمام خیرات یعنی بھلائیاں اس سے نکلتی ہیں۔ پس وہ ایسے شخص سے محبت کرتا ہے جو دوسروں سے نیکی کرے اور پھر اس سے کثرت معنی ہو گئے ہیں۔ اس لیے جُمْلَةً کے معنی کل ہیں ﴿لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً﴾ [الفرقان: 32:25] ''اس پر قرآن (سارے کا) سارا ایک دفعہ ہی کیوں نہ اتارا گیا'' اور جس چیز کی تفصیل نہ ہوا سے مجمل کہا جاتا ہے اور جَمَل اونٹ کو کہتے ہیں جب اس کے سب دانت نکل آئیں ﴿حَتّٰى يَلِجَ الْجَمَلُ فِيْ سَمِّ الْخِيَاطِ﴾ [الأعراف: 40:7] ''جب تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل نہ ہو'' اور اس کی جمع جِمَالٌ اور جِمَالَةٌ آتی ہے ﴿كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ﴾ [المرسلات: 33:77] ''گویا وہ زرد اُونٹ ہیں۔''

ان تین قوموں کے ذکر میں یہ سمجھایا کہ اعمال کی جزا حق ہے۔ اس لیے اب عام کر کے سمجھایا کہ آسمان اور زمین میں جہاں تک

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ﴿۸۶﴾ تیرا رب سب کا پیدا کرنے والا جاننے والا ہے۔

وَ لَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَ الْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ﴿۸۷﴾ اور ہم نے ہی تجھے سات بار بار دہرائی گئی (آیتیں) اور عظمت والا قرآن دیا ہے۔ (1710)

بھی دیکھتے جاؤ یہی معلوم ہوگا کہ کوئی فعل بے نتیجہ نہیں۔ پس اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ وہ قوم جو اعمال بد میں بڑھتی چلی جاتی ہے آخر اس کی صف لپیٹ دی جائے اور اَلسَّاعَةَ سے مراد یہاں وہی قوم کی تباہی کا وقت ہے جسے [اَلسَّاعَةِ الْوُسْطٰى] کہا جاتا ہے [دیکھو نمبر: 108]۔ اسی لیے اس کے بعد درگزر کا حکم دیا۔ کیونکہ ان کی سَاعَةٌ ان کی مغلوبیت تھی۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ﴿اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَ بَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ﴿۳۴﴾﴾ [حٰمٓ السجدة: 34:41] ''(بدی کو) بہت اچھے طریقے سے دور کر، پھر تو دیکھے گا کہ وہ شخص کہ تجھ میں اور اس میں دشمنی ہے گویا وہ دل سوز دوست ہے۔'' یا فرمایا ﴿عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَ بَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً﴾ [الممتحنة: 7:60] ''قریب ہے کہ اللہ تمہارے اور ان لوگوں کے درمیان جن کے ساتھ ان میں سے تمہاری دشمنی ہے محبت پیدا کر دے۔''

1710 - مَثَانِيْ۔ اس کا اصل ثِنْيٌ ہے اور ثِنِيٌ اور اِثْنَانِ گنتی کے اعتبار سے بھی بولا جاتا ہے اور دوبارہ لانے کے اعتبار سے بھی اور دونوں کے اعتبار سے بھی۔ اور ثَنَاء حمد کو کہتے ہیں اس لیے کہ اس کا ذکر بار بار کیا جاتا ہے اور مَثَانِيْ (مَثْنَاةٌ کی جمع) قرآن کریم کی سورتوں کو کہا گیا ہے۔ اس لیے کہ وہ بار بار دہرائی جاتی ہیں یعنی ہمیشہ پڑھی جاتی ہیں اور دوسری جگہ قرآن کریم کو مثانی کہا ہے ﴿اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ﴾ [الزمر: 23:39] ''اللہ نے بہترین کلام اتارا ہے (یعنی) کتاب جس کی باتیں ملتی جلتی دہرائی گئی ہیں۔'' اور یہ بھی درست ہے کہ **قرآن شریف کو مثانی اس لیے کہا گیا ہے کہ اس کے فوائد بار بار اور ازسرنو تازہ ہوتے رہتے ہیں۔** جیسا کہ حدیث میں اس کی صفت میں ہے کہ [لَا يَعْوَجُّ فَيُقَوَّمُ وَلَا يَزِيغُ فَيَسْتَعْتِبُ وَلَا تَنْقَضِي عَجَائِبُهُ] (مصنف ابن ابی شیبة، کتاب فضائل القرآن، باب فِي التّمسّكِ بِالقرآنِ، حدیث:30630) یعنی جب کبھی اس میں کجی پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی تو اللہ تعالیٰ اسے دور کر کے اسے قائم کرنے کے سامان کر دے گا اور جب اس میں زیغ پیدا کیا جائے گا تو اللہ تعالیٰ اسے دور کر دے گا اور اس کے عجائبات کبھی ختم نہ ہوں گے۔ اور اس لحاظ سے بھی مثانی کا لفظ اس پر صادق آتا ہے کہ اس میں سے ایسی باتیں ہمیشہ ظاہر ہوتی رہیں گی جن کی وجہ سے اس کی ثنا ہوتی رہے گی اور اس کی بھی جو اسے پڑھے اور سیکھے اور اس پر عمل کرے۔ اور اسی معنی میں قرآن شریف کو کریم بھی کہا ہے ﴿اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ﴿۷۷﴾﴾ [الواقعة: 77:56] ''یقیناً یہ قرآن نفع پہنچانے والا ہے۔'' اور مجید بھی ﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ﴿۲۱﴾﴾ [البروج: 21:85] ''بلکہ وہ ایک قرآن بڑی شان والا ہے۔'' (غ)

﴿سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ﴾ سے کیا مراد ہے۔ بخاری میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی اور ایک دوسرے صحابی سے روایت ہے کہ نبی کریم

لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَ لَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَ اخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝۸۸

تو اپنی آنکھوں کو اس طرف نہ لگا جو ہم نے ان میں سے کئی قسم کے لوگوں کو چند روزہ سامان دیا ہے اور ان کے لیے غم نہ کھا اور مومنوں کے لیے اپنے بازوؤں کو جھکا۔ (1711)

ﷺ نے فرمایا کہ یہ سورۃ فاتحہ ہے اور دونوں روایتوں میں اسی کو قرآن عظیم بھی فرمایا ہے۔ بایں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اور مجاہد وغیرھما سے روایت ہے کہ اس سے مراد سات لمبی سورتیں ہیں یعنی پہلی ساتوں سورتیں۔ (ج) لیکن یہ سورت مکی ہے اور سات لمبی سورتوں میں سے پانچ مدنی ہیں۔ اس لیے بھی یہ معنی قابل قبول نہیں۔ اور یہ یقینی امر ہے کہ اس سے مراد سورہ فاتحہ ہی ہے جو اس وقت نازل ہو چکی تھی اور نمازوں میں دہرائی جاتی تھی۔ اور وہ اس لحاظ سے بھی مثانی بالخصوص کہلائے گی کہ نماز میں یہی حصہ ہے جو بار بار دہرایا جاتا ہے اور اس کے ساتھ کوئی سورت یا حصہ اور پڑھا جاتا ہے اور ہر رکعت میں دہرائی صرف یہی سورت جاتی ہے اور اس کی سات آیات بھی ہیں۔ اور قرآن عظیم اس کو اس معنی سے کہا جیسے ام الکتاب۔ اس لیے کہ اس میں ساری تعلیم قرآنی کا نچوڑ موجود ہے اور اس کا ذکر اس لیے کیا کہ اگر لوگوں کے پاس مال و دولت ہے (دیکھو اگلی آیت) جس کے بھروسہ پر وہ تمہاری مخالفت کرتے ہیں تو تمہارے پاس وہ حق موجود ہے جس کے سامنے کوئی چیز ٹھہر نہیں سکتی اور وہی غالب آ کر رہے گا۔

1711 - ﴿تَمُدَّنَّ﴾۔ مَدَّ کے معنی کھینچنا ہیں اور مُدَّۃٌ وقت مُمْتَدٌ یعنی لمبے وقت کو کہتے ہیں اور حرف کی مَدّ اس کا لمبا کرنا اور کسی چیز کی طرف [مَدَّ بَصَرَ] یا [مَدَّ عَيْنٌ] سے مراد ہوتی ہے اس کی حرص کرنا یا اس کا خواہش مند ہونا۔ (غ)

﴿اَزْوَاجًا﴾۔ اَزْوَاجٌ۔ زَوْجٌ کی جمع ہے [دیکھو نمبر: 39 (اور 1026]۔ اور چونکہ ہر ایک قرین یا ہمنشین پر یہ لفظ بولا جاتا ہے اس لیے ازواج کے معنی یہاں اِشْبَاہُ اور اِقْرَانٌ ہیں۔ (غ) یعنی ایک دوسرے سے ملتے جلتے لوگ اور اَصْنَافٌ بھی اس کے معنی کیے ہیں۔ یعنی قسم قسم کے لوگ اور بعض نے تکلف کر کے [رِجَالًا مَعَ نِسَائِهِمْ] بھی کہا ہے یعنی مرد اور ان کی عورتیں۔ (ر)

﴿اخْفِضْ جَنَاحَكَ﴾ خَفْضٌ۔ رفع کی ضد ہے ﴿خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ۝﴾ [الواقعة: 3:56] ''(وہ کسی کو) نیچا کرنے والی (کسی کو) بلند کرنے والی (ہے)۔'' اور جناح جانب کو کہتے ہیں اور مراد [خَفْضِ الْجَنَاحِ] یا پہلو کے نیچا یا نرم کرنے سے نرمی کا اختیار کرنا ہے۔ جب اس عظیم الشان حق کا ذکر کیا جو نبی کریم ﷺ کو دیا گیا تو اس کے بالمقابل جن چیزوں پر لوگ فخر کرتے ہیں ان کا ذکر بھی کیا یعنی دنیا کا مال اور اس کی نعمتیں اور آسائشیں۔ بعض نے یہاں مراد امت کو لیا ہے کیونکہ نبی کریم ﷺ ابتدائے زندگی سے ہی کبھی مال دنیا کی پروانہ کرتے تھے لیکن [دیکھو نمبر: 142 و 727]۔ ہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آئندہ زمانہ کی طرف اشارہ ہے جب سامان دنیوی کی افراط اس قدر دنیا میں ہونے والی تھی۔ تو یہ سمجھایا ہے کہ دنیا کے مال و متاع کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھو کیونکہ تمہارے پاس اس سے بہت بڑھ کر دولت ہے۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا جس شخص کو قرآن دیا گیا پھر اس نے یہ خیال کیا کہ دنیا میں اس سے بڑھ کر بھی کوئی چیز کسی کو دی گئی ہے تو اس نے

وَ قُلْ اِنِّیْۤ اَنَا النَّذِیْرُ الْمُبِیْنُ ۚ﴿۸۹﴾ اور کہہ میں کھلے طور پر ڈرانے والا ہوں۔

كَمَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِیْنَ ۙ﴿۹۰﴾ جس طرح ہم نے قسمیں کھانے والوں پر اتارا۔(1712)

ایک عظیم الشان چیز کو حقیر جانا اور ایک حقیر چیز کو بڑا سمجھا۔ ﴿وَ لَا تَحْزَنْ عَلَیْهِمْ﴾ دوسری جگہ عیسائیوں کے ذکر میں ہے ﴿فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ یُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِیْثِ اَسَفًا﴾ [الکھف: 6:18] ''تو کیا تُو اپنی جان کو ان کے پیچھے غم میں ہلاک کر دے گا اگر وہ اس بات پر ایمان نہ لائیں۔'' اور یا اس وجہ سے کہ وہ اپنے اموال کو حق کی مخالفت پر خرچ کرتے تھے۔ تو مراد یہ ہے کہ ایسے لوگوں کا استیصال ضروری ہے۔

1712- ﴿مُقْتَسِمِیْنَ﴾۔ قَسَمَ کے معنی تقسیم کیا اور [تَقَاسَمَا الْمَالَ] اور [اِقْتَسَمَاهُ] کے معنی ہیں ان دونوں نے باہم مال تقسیم کیا۔ اور اسی سے قِسْمَةٌ ہے ﴿وَ اِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ﴾ [النسآء: 8:4] ''اور جب تقسیم کے وقت موجود ہوں۔'' اور [قَسَمَ اَمْرُهُ] اور اِقْتَسَمَ کے معنی یوں بھی آتے ہیں کہ اس معاملہ میں سوچتا رہا کہ اسے کرے یا نہ کرے اور اَقْسَمَ کے معنی ہیں قسم کھائی اور [تَقَاسَمَ الْقَوْمَ] سب لوگوں نے ایک دوسرے سے عہد کے طور پر قسم کھائی ﴿تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ﴾ [النمل: 49:27] ''اللہ کی قسم کھاؤ۔'' (ل) یہاں مُقْتَسِمِیْنَ سے مراد راغب نے وہ لوگ لیے ہیں جنہوں نے مکہ کی گھاٹیوں میں باہم قسمیں کھائی تھیں کہ جو لوگ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئیں انہیں روک دیں گے یا نبی کریم ﷺ کے خلاف تدابیر کرنے پر باہم قسمیں کھالی تھیں اور بخاری نے بھی اس کے معنی [اَلَّذِیْ حَلَّفُوْا] ہی کیے ہیں۔ یعنی وہ لوگ جنہوں نے قسمیں کھائی تھیں۔ اور بعض نے اِقْتِسَامٌ سے مراد قرآن شریف کی تقسیم لی ہے یعنی ایسے لوگ جنہوں نے ایک حصہ کو حق کہا اور دوسرے کو باطل جیسا کہ اہل کتاب کرتے تھے۔ یہی مضمون اگلی آیت میں بیان ہوا ہے۔

آئندہ زمانہ کے عذاب کی پیشگوئی:

کَمَا کو ﴿وَ لَقَدْ اٰتَیْنٰكَ﴾ کے متعلق سمجھا گیا ہے۔ مگر یہاں انزال وحی کا ذکر نہیں بلکہ انزال عذاب کا ذکر ہے جس کی طرف ﴿اَنَا النَّذِیْرُ الْمُبِیْنُ﴾ میں اشارہ ہے۔ جب عذاب سے ڈرایا تو فرمایا کہ ہم اسی طرح عذاب نازل کریں گے جس طرح قسمیں کھانے والوں پر اتارا جنہوں نے قرآن کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اب ظاہر ہے کہ یہ سورت مکی ہے اور ابھی نہ اہل کتاب پر عذاب اترا تھا نہ اہل مکہ پر۔ اس لیے بعض نے خیال کیا کہ مُقْتَسِمِیْنَ سے مراد پہلے انبیاء کے مخالف ہیں اور اگلی آیت میں اَلْقُرْاٰنَ سے بھی پہلی کتب منزلہ کو مراد لے لیا ہے۔ مگر یہ بالبداہت غلط ہے۔ القرآن کا لفظ ان پر صادق نہیں آ سکتا۔ پس مراد اس سے کسی آئندہ زمانہ کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ [نمبر:1711] میں دکھایا گیا جب دنیا کے سامان بہت ترقی کر جائیں۔ تو فرمایا کہ ان پر بھی ہم اسی طرح پر عذاب نازل کریں گے جس طرح ان سے پہلے لوگوں پر کیا جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی مخالفت پر قسمیں کھائیں۔ اور اس صورت میں اَنْزَلْنَا کا استعمال بہ سبب تحقق وقوع درست ہے۔ اس لیے کہ انہیں بار بار اس کی پیشگوئیاں سنادی گئی تھیں۔

الَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ ﴿۹۱﴾

جنہوں نے قرآن کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ (1713)

فَوَ رَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۹۲﴾

سو تیرے رب کی قسم ہم ضرور ان سب سے پوچھیں گے۔

عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾

جو وہ عمل کرتے تھے۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۹۴﴾

سو کھول کر کہہ دے جو تجھے حکم دیا جاتا ہے اور مشرکوں کا خیال نہ کر۔ (1714)

یہ بھی یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ اصحاب الحجر ہی (جن کے نام پر سورت ہے) وہ لوگ تھے جن کے متعلق اپنے پیغمبر کے خلاف قسمیں کھانے کا ذکر ہے ﴿قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَ اَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۴۹﴾﴾ [النمل: 49:27] ''انہوں نے کہا اللہ کی قسم کھاؤ کہ ضرور ہم اس پر اور اس کے اہل پر رات کے وقت حملہ کریں گے۔ پھر ہم اس کے ولی کو کہہ دیں گے ہم اس کے گھر والوں کی ہلاکت پر موجود نہ تھے اور ہم بالکل سچے ہیں۔'' اور بعینہ یہی معاملہ ہمارے نبی کریم ﷺ کے خلاف ہوا۔

1713 - ﴿عِضِيْنَ﴾۔ عَضُوْنَ۔ عِضَةٌ کی جمع ہے اور اس کی اصل عِضْوَةٌ ہے جس کے معنی جزو ہیں اسی سے عُضْوٌ اور عِضْوٌ ہے کیونکہ عضو بھی جسم کا ایک جزو ہے اور تَعْضِيَةٌ کے معنی ٹکڑے ٹکڑے کرنا آتے ہیں۔ (ل) اور قرآن کو عِضِيْنَ بنانے سے یہ منشا ہے کہ کسی حصہ پر ایمان لاتے ہیں اور کسی کا انکار کرتے ہیں اور یا یہ کہ کبھی اسے سحر کہتے ہیں، کبھی کہانت، کبھی شعر وغیرہ۔ بخاری میں سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے پہلے معنی مروی ہیں اور یہود و نصاریٰ مراد لیے گئے ہیں۔

1714 - اصْدَعْ۔ صَدْعٌ۔ سخت اجسام میں شق کرنے کو کہتے ہیں اور [صَدَعَ الْاَمْرَ] کے معنی ہیں اس کو کھول دیا اور صُدَاعٌ سخت سر درد کو کہتے ہیں گویا درد سے سر پھٹ رہا ہو۔ اسی لحاظ سے ﴿لَا يُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا﴾ [الواقعة: 19:56] ''اس سے انہیں دردِ سر نہ ہوگا۔'' اور [تَصَدَّعَ الْقَوْمَ] کے معنی ہیں تَفَرَّقُوْا پراگندہ ہو گئے۔ ﴿يَوْمَئِذٍ يَّصَّدَّعُوْنَ﴾ [الروم: 43:30] ''اس دن وہ الگ الگ ہو جائیں گے۔''

بار بار انذار کی ضرورت:

مشرکوں سے اعراض کے یہ معنی ہیں کہ ان کی مخالفت اور عداوت اور منصوبوں کی کچھ پروا نہ کرو اور کھول کھول کر بیان کرتے چلے جاؤ۔ یہ سورت مکہ کے آخری زمانہ کی ہے اور نبی کریم ﷺ اس سے پہلے بھی کھول کر ہی بیان فرماتے تھے۔ مگر اب چونکہ آپ کو مٹانے کے لیے کفار کی طرف سے سخت ترین منصوبے ہو رہے تھے اس لیے فرمایا کہ پروا نہ کرو۔ اور یہ بھی بتا دیا کہ اسلام کی اصل کامیابی اسی میں ہے کہ قرآن شریف کو کھول کھول کر بیان کر دیا جائے۔ جس طرح سخت چیز میں شق کرنے کے لیے بار بار

اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ﴿۹۵﴾

ہم تیری طرف ہنسی کرنے والوں (کی سزا) کے لیے کافی ہیں۔

الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۹۶﴾

جو اللہ کے ساتھ دوسرا معبود قرار دیتے ہیں سو عنقریب جان لیں گے۔

وَ لَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ﴿۹۷﴾

اور ہم جانتے ہیں کہ تیرا دل اس سے تنگ پڑتا ہے جو یہ کہتے ہیں۔

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَ كُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۹۸﴾

سو اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کرتا رہ اور سجدہ کرنے والوں میں رہ۔

ع 6 20 6 وَ اعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ﴿۹۹﴾

اور اپنے رب کی عبادت کرتا رہ یہاں تک کہ تجھ پر موت آ جائے۔ (1715)

ضرب لگانے کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح ان سخت دلوں پر جو دنیا کی آلائشوں میں ملوث ہیں صداقت تب ہی اثر کرتی ہے جب اسے بار بار پیش کیا جائے۔

1715 - ﴿الْيَقِيْنُ﴾ - یقین کے معنی یہاں موت ہیں دیکھو بخاری۔ کیونکہ اس کا آنا یقینی ہے۔ اور بعض نے نصرت مراد لی ہے جو کفار کے خلاف آپ کو ملنے کا وعدہ تھا۔

عبادت کب تک ہے:

الحاد پسند طبائع نے ان الفاظ کی تاویل یوں کر لی ہے کہ اسی وقت تک عبادت کرنے کا حکم ہے جب تک یقین آ جائے اور وہ کہتے ہیں کہ چونکہ ہمیں وہ یقین کا مرتبہ حاصل ہو گیا اس لیے اب ہمیں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی ضرورت نہیں رہی۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ مراد اس سے ہوتی تو کیا نبی کریم ﷺ کو ساری عمر یقین نہ آیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں آپ کے قدم تک سوج جاتے تھے۔ یقین کے معنی یہاں موت ہیں۔ لیکن اگر عام معنی بھی یہاں مراد لیے جائیں تو یہ مطلب نہیں کہ یقین آئے تو عبادت چھوڑ دو۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ عبادت الٰہی سے یقین پیدا ہوتا ہے۔ سو عبادت کرو تا کہ وہ یقین کا مرتبہ حاصل ہو اور جب یقین کا مرتبہ حاصل ہو جائے تو پھر عبادت میں خود ایسی لذت پیدا ہو جائے گی کہ انسان عبادت کو نہ چھوڑ سکے گا۔

سورۃ النحل

نام:

اس سورت کا نام اَلنَّحْل ہے اور اس میں 16 رکوع اور 128 آیات ہیں۔ نَحْل کے معنی شہد کی مکھی ہیں اور اس سورت میں جہاں یہ دکھایا ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ کی قدرت حیوانات تک میں کام کرتی ہوئی انسان کے لیے اچھی سے اچھی چیزیں پیدا کر دیتی ہے۔ شہد کی مکھی کی نسبت لفظ وحی استعمال کر کے اشارہ کر دیا ہے کہ ان مثالوں میں جہاں دودھ اور شہد کے حیوانات کے ذریعہ پیدا کرنے کا ذکر ہے اصل غرض وحی الٰہی کی طرف توجہ دلانا ہے۔ شہد کی نسبت بالخصوص لفظ بھی ایسے ہی استعمال فرمائے ہیں یعنی ﴿فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ﴾[69] جیسے خود قرآن شریف کے متعلق، گویا ایک میں جسمانی بیماریوں کے لیے شفا ہے تو دوسرے میں روحانی بیماریوں کے لیے شفا ہے۔ یوں تو حیوانات میں جس قدر ہدایت فطرتاً ملتی ہے وہ سب ان کے لیے وحی کا ہی حکم رکھتی ہے۔ مگر شہد کی مکھی کا انتخاب بالخصوص وحی کے ذکر کے لیے اس لیے کیا کہ جس طرح شہد کی مکھی مختلف پھولوں پر بیٹھ کر ان کی مٹھاس کو چوس کر ایک اعلیٰ درجہ کی شیریں اور شفا دینے والی چیز پیدا کر دیتی ہے اسی طرح وحی الٰہی جو قرآن میں ہے اس نے تمام بہترین ہدایات عالم کو جو کبھی دی گئی ہوں اس پاک کتاب کے اندر جمع کر دیا ہے۔ جس طرح پھولوں سے مٹھاس کو انسان لے کر شہد کی صورت نہیں دے سکتا اسی طرح کسی انسان کا یہ کام نہ تھا کہ ان تمام بہترین ہدایات کو ایک جگہ جمع کر سکتا اور پھر ان کو ایسا رنگ دے سکتا کہ وہ روحانی بیماریوں کے لیے شفاء کا کام دیتیں۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں شہد کی مکھی کی وحی کا ذکر ہے اس سے تین آیتیں پہلے قرآن کریم کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے کہ یہ کتاب تمام اختلافات کا فیصلہ کرنے کے لیے نازل کی گئی ہے اور تمام اختلافات مذاہب کا فیصلہ ہو نہ سکتا تھا جب تک کہ تمام کی بہترین ہدایات جو باقی رکھنے کے قابل تھیں ایک نئی اور بہترین شکل میں محفوظ نہ کر دی جاتیں۔ پھول آج پیدا ہوتا ہے اور کل اپنی مٹھاس سمیت ختم ہو جاتا ہے۔ مگر شہد جو اس سے ایک حیوان کی وحی فطرت نے پیدا کیا وہ کبھی نہیں بگڑتا۔

خلاصہ مضمون:

سورت کی ابتدا ان الفاظ سے کی ہے جو اس کا تعلق پچھلی سورت سے کھلے طور پر قائم کرتے ہیں۔ کیونکہ اس کا خاتمہ اعدائے اسلام کے انذار پر کیا تھا اور اس کے پہلے لفظ ہی یہ ہیں ﴿اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ﴾ وہ اللہ کا امر آ ہی گیا سمجھو جو اللہ کی بھیجی ہوئی صداقت کی تکذیب پر آیا کرتا ہے۔

① اور پھر اس کے ساتھ ہی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنی وحی جس پر چاہتا ہے بھیجتا ہے۔ اور رکوع کی آخری آیت میں فرمایا کہ ﴿قَصْدُ السَّبِيْلِ﴾ سوائے اللہ تعالیٰ کی وحی کے نہیں مل سکتا۔ اور درمیان میں آسمانوں اور زمین اور انسان اور حیوانات کی ظاہری

پیدائش کی طرف توجہ دلائی کہ جو اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کاملہ سے یہ چیزیں پیدا کرتا ہے۔ اس کے ہدایت انسان کے لیے وحی بھیجنے پر تعجب کیوں کرتے ہو۔

② دوسرے رکوع میں توحید الٰہی پر صحیفۂ قدرت کی شہادت بیان فرمائی۔ کیونکہ وحی الٰہی کا سب سے بڑا کام دنیا میں توحید الٰہی کا قائم کرنا ہے۔ اور خلق کو توحید پر بطور دلیل پیش کیا جو سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کوئی نہیں کر سکتا۔

③ تیسرے رکوع میں بتایا کہ توحید کی طرف تو کم وبیش صحیفۂ قدرت بھی رہنمائی کر دیتا ہے مگر بعد الموت زندگی جس کی طرف صرف وحی الٰہی رہنمائی کرتی ہے، اس پر ایمان کے بغیر توحید الٰہی پر ایمان بھی ناقص ہی ہوتا ہے اور آخرت کا منکر عملاً توحید کا بھی منکر ہے۔

④ چوتھے رکوع میں اس حق کے خلاف جو وحی الٰہی لاتی ہے تدابیر کے انجام کا ذکر کیا کہ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے لوگ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے اور اعلیٰ صفات سے محروم رہ جاتے ہیں۔

⑤ پانچویں رکوع میں مشرکین کے باطل عذروں کا ذکر ہے جو انہیں آخر کار کچھ کام نہ دیں گے۔

⑥ چھٹے میں اعدائے حق کی سزا کا ذکر ہے اور یہاں صاف الفاظ میں بتا دیا ہے کہ کس کس قسم کے عذاب ان پر آئیں گے۔

⑦ ساتویں میں بتایا ہے کہ خود فطرت انسانی شرک کو قبول نہیں کرتی۔

⑧ آٹھویں میں بتایا ہے کہ وحی الٰہی کی ضرورت دنیا سے ظلم کو دور کرنے کے لیے اور اختلافات مذاہب کو دور کرنے کے لیے تھی۔

⑨ نویں میں وحی الٰہی کی ضرورت کو تمثیلات کے رنگ میں بیان کیا۔

⑩ دسویں میں مہبط وحی ﷺ کی فضیلت کا ذکر کیا۔

⑪ گیارہویں میں مہبط وحی کے انکار کا

⑫ اور بارہویں میں اس انکار کی سزا کا ذکر ہے۔

⑬ تیرہویں میں قرآن کریم کی تعلیم کامل کا ایک نمونہ بتایا اور اس پر قیام کی ضرورت کو واضح کیا۔

⑭ چودھویں میں وجوہات دیں کہ یہ وحی افترا نہیں۔

⑮ پندرھویں میں بالخصوص مکہ والوں کو انذار کیا کہ ان کی حالت امن واطمینان تبدیل کر دی جائے گی۔

⑯ اور سولھویں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مثال کا ذکر کر کے مومنوں کو نصیحت پر سورت کا خاتمہ کیا۔

تعلق:

یہ سورت الٓرٰ کے مجموعہ کی ہی آخری سورت سمجھنی چاہیے۔ گو یہ الٓرٰ سے شروع نہیں ہوتی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان تمام

اٰیَاتُھَا 128 (16) سُوْرَةُ النَّحْلِ مَكِّيَّةٌ (70) رُکُوْعَاتُھَا 16

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ بے انتہا رحم والے بار بار رحم کرنے والے کے نام سے

اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ①

اللہ کا حکم آ گیا سو اس کے لیے جلدی مت کرو۔ وہ پاک ہے اور اس سے بلند ہے جو وہ شریک بناتے ہیں۔(1716)

یُنَزِّلُ الْمَلٰٓىِٕكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖۤ اَنْ اَنْذِرُوْۤا اَنَّهٗ

وہ فرشتوں کو وحی کے ساتھ اپنے حکم سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اتارتا ہے کہ بتا دو کہ میرے سوائے

سورتوں میں عموماً گزشتہ واقعات کی طرف توجہ دلا کر مخالفین کی ناکامی کا ذکر کیا ہے اور اس میں ایسا کوئی ذکر نہیں بلکہ صحیفۂ قدرت اور فطرت کی شہادت کو وحی الٰہی کی صداقت پر پیش کیا ہے۔ اور ضمناً اس صداقت کو رد کرنے والوں کا ذکر بھی آ گیا ہے۔ اور یوں یہ سورت انہی پہلی چھ سورتوں کے مضمون کی تکمیل کرتی ہے۔

زمانۂ نزول:

اس سورت کا نزول بھی نبی کریم ﷺ کے مکی زمانہ کے آخری ایام کا ہے۔ اس لیے کہ اس میں صاف طور پر ہجرت کا ذکر ہے جو مدینہ کی طرف شروع ہو چکی تھی۔ اور اس ہجرت کے ذکر سے جن لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ایسی آیات مدنی ہیں انہوں نے غلطی کھائی ہے۔ کیونکہ نبی کریم ﷺ کے مدینہ جانے سے بہت دن پیشتر صحابہ کی ہجرت شروع ہو چکی تھی۔ یوں بلحاظ زمانہ نزول بھی یہ سورت اسی الٓرٰ کے مجموعہ کی سورتوں میں شامل ہے اور بلحاظ مضمون بھی۔

1716 - ﴿اَمْرُ اللّٰهِ﴾ یا اللہ کے حکم کے آنے سے کیا مراد ہے؟ ابن جریر کہتے ہیں وہ عذاب جس کا کفار کو وعدہ دیا جاتا تھا۔ اور سیاق بھی اسی معنی کو چاہتا ہے۔ پچھلی سورت کے آخر پر بھی یہی ذکر تھا۔ مگر اس عذاب کو یا مخالفت کے استیصال کو امر اللہ صرف اس لیے نہیں کہا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے متعلق حکم ہو چکا تھا بلکہ اس لیے بھی کہ اس کے ساتھ ''خدا کی بادشاہت'' جس کی خوش خبری بار بار حضرت مسیح نے دی تھی زمین پر آنے والی تھی۔ اور نبوت کے ساتھ اسلام کی بادشاہت قائم ہونے والی تھی۔ اور ﴿فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ﴾ اس لیے فرمایا کہ کفار اس عذاب کے لیے جلدی کرتے تھے۔ ﴿یَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ﴾ [العنکبوت: 54:29] ''تجھ سے عذاب کے لیے جلدی کر رہے ہیں۔'' اور اس امر اللہ کے ساتھ شرک کی نفی میں یہ اشارہ ہے کہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی توحید قائم ہو گی۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ ۝۲ — کوئی معبود نہیں سو میرا تقویٰ اختیار کرو۔ (1717)

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝۳ — اس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا، وہ اس سے بلند ہے جو وہ شریک بناتے ہیں۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ۝۴ — انسان کو نطفہ سے پیدا کیا۔ پھر دیکھو وہ کھلم کھلا جھگڑا کرنے والا ہے۔ (1718)

1717- رُوْح کے معنی کے لیے [دیکھو نمبر: 111] اور یہاں **روح سے مراد وحی الٰہی ہی ہے** کیونکہ یہاں ذکر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے روح نازل کرتا ہے اور روح جو حیات ہے یا جو نفس ناطقہ ہے وہ تو سب کو ملتی ہے اور اسی روح کے نازل کرنے کا نتیجہ بھی انذار ہے۔ پس یہ یقیناً وحی الٰہی ہے اور یہاں اشارہ قرآن کریم کے نزول کی طرف ہے۔ اور پہلی آیت سے تعلق یہ ہے کہ یہ غالب آ کر رہے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ بیسود کام نہیں کرتا۔ کیونکہ اس کی ساری خلق ہی بالحق ہے۔ جیسا کہ اگلی آیت میں بیان فرمایا۔ تو حق کا نازل کرنا جس غرض کے لیے ہے ضرور ہے کہ وہ بھی پوری ہو کر رہے۔

1718- نُّطْفَةٍ۔ اصل میں [اَلْمَآءُ الصَّافِي] یعنی مصفی پانی کو کہتے ہیں۔ (غ۔ت۔ل) خواہ قلیل ہو یا کثیر۔ دونوں کی مثال حدیث میں موجود ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے پوچھا کہ کیا وضو کے لیے پانی ہے [فَجَاءَ رَجُلٌ بِنُطْفَةٍ فِي إِدَاوَةٍ] (اتحاف الخيرة المهرة، كتاب علامات النبوة، حديث:6492) تو ایک شخص لوٹے میں تھوڑا سا پانی لایا۔ جہاں تھوڑے پانی کے لیے بِنُطْفَةٍ کا لفظ استعمال فرمایا اور دوسری حدیث میں ہے [لَا يَزَالُ اللهُ يَزِيْدُ الْإِسْلَامَ وَأَهْلِهِ وَيَنْقُصُ الشِّرْكَ وَأَهْلِهِ حَتّٰى يَسِيْرَ الرَّاكِبَ بَيْنَ النُّطْفَتَيْنِ لَا يَخْشٰى إِلَّا جَوْرًا] (كنز العمال، كتاب الفضائل من قسم الافعال، باب المعجزات ودلائل النبوة، حديث: 35407) یعنی اسلام اور اس کے اہل بڑھتے رہیں گے اور شرک اور اس کے اہل گھٹتے چلے جائیں گے۔ یہاں تک کہ ایک سوار دونوں سمندروں کے درمیان چلا جائے گا اسے کوئی خوف نہ ہوگا، سوائے اس کے کہ رستہ بھول جائے۔ جہاں دو نطفوں سے مراد عرب کے دونوں طرف کے سمندر یا مغرب میں سمندر اور مشرق میں دریائے فرات ہیں جو عرب کی حدود ہیں۔ (ل) اور [نُطْفَةٌ، مَاءَ الرَّجُلَ] کو بھی کہا جاتا ہے جو اس کے مشہور معنی ہیں، لسان العرب میں ہے کہ یہ نام اس کی قلت کی وجہ سے ہے۔ مگر چونکہ قلت و کثرت کے دونوں مفہوم لفظ میں پائے جاتے ہیں اس لیے یہ زیادہ صحیح ہوگا کہ اس کے مصفی پن کی وجہ سے ہے۔ گویا یہ ایک مصفی جوہر ہے کیونکہ زمین کا خلاصہ پھلوں، سبزیوں، اناج میں آتا ہے، جس سے انسان کی غذا بنتی ہے۔ غذا سے مصفی جوہر خون پیدا ہوتا ہے اور خون کا مصفی جوہر وہ پانی ہے جس سے انسان بنتا ہے۔

وَ الْاَنْعَامَ خَلَقَهَا ۚ لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّ مَنَافِعُ وَ مِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝۵

اور چار پایوں کو اسی نے پیدا کیا تمہارے لیے ان میں گرمی کا سامان ہے اور کئی فائدے ہیں اور ان میں سے تم کھاتے ہو۔(1719)

وَ لَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَ حِيْنَ تَسْرَحُوْنَ ۝۶

اور تمہارے لیے ان میں خوبصورتی کا سامان ہے جب تم شام کو (انہیں) واپس لاتے ہو اور جب چرانے لے جاتے ہو۔(1720)

وَ تَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ ؕ اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝۷

اور وہ تمہارے بوجھ ایسے مقامات کی طرف اٹھا لے جاتے ہیں ہیں جہاں تم سوائے جانوں کو مشقت میں ڈالنے کے نہیں پہنچ سکتے تھے۔ یقیناً تمہارا رب مہربان رحم کرنے والا ہے۔

آسمانوں اور زمین کی پیدائش کے بعد انسان کا ذکر کیا ہے اور اس کی ابتدا کی طرف اشارہ کر کے اپنی قدرت کاملہ کا ذکر کیا ہے کہ کس طرح پر مصفی خلاصہ در خلاصہ نکلتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ انسان بنتا ہے۔ بایں انسان اللہ تعالیٰ کی قدرت میں جھگڑا کرتا ہے اور اسے اس موت کے بعد زندگی جس کے لیے وحی الٰہی انسان کو تیار کرتی ہے ایک بعید بات معلوم ہوتی ہے۔

1719 - ﴿دِفْءٌ﴾۔ بَرد یعنی سردی۔(غ) یا[حِدَّةُ الْبَرْدِ] یعنی سردی کی تیزی۔(ل) کی نقیض ہے۔

انسان سے نیچے اتر کر چار پایوں کا ذکر کیا جو جاندار ہونے میں انسان کے شریک ہیں اور یہ بتا کر کہ ان میں انسانوں کے لیے فوائد ہیں یہ ظاہر کیا کہ انسان کی زندگی کی کوئی اور بلند غرض ہے۔

1720 - ﴿تُرِيْحُوْنَ﴾ اصل اس کا رُوْح ہے اور رَوَاح زوال آفتاب کے بعد کا وقت ہے گویا کہ وہ راحت کا وقت ہے اور رَاح کے معنی زوال آفتاب کے بعد گیا جیسا کہ جمعہ کے لیے جانے پر بولا گیا ہے اور [اَرَاحَ يُرِيحُ] کی مصدر اِرَاحَةٌ کے معنی ہیں اونٹ بکری کو چرانے کے بعد اس کے رات کو آرام کرنے کی جگہ واپس لانا۔(ل)

﴿تَسْرَحُوْنَ﴾۔ سَرَح ایک خاص درخت ہے اور اونٹ وغیرہ کو اس درخت کے چرانے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے اور پھر عام طور پر چرانے کے لیے لے جانے پر بولا گیا ہے۔(غ) تُرِيْحُوْنَ کو تَسْرَحُوْنَ سے پہلے رکھنے کی وجہ لفظ جمال کا استعمال ہے کیونکہ جانور جب چر کر آئے تو زیادہ خوبصورت ہوتا ہے۔

وَّ الْخَيْلَ وَ الْبِغَالَ وَ الْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَ زِيْنَةً ؕ وَ يَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۸

اور گھوڑے اور خچریں اور گدھے (پیدا کیے) تا کہ تم ان پر سوار ہو اور زینت کا سامان ہو اور وہ وہ کچھ پیدا کرتا رہتا ہے جو تم نہیں جانتے۔ (1721)

وَ عَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَ مِنْهَا جَآئِرٌ ؕ وَ لَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝۹ ع

اور اللہ پر ہی سیدھی راہ پر چلانا ہے اور بعض راہیں ٹیڑھی ہیں اور اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت کرتا۔ (1722)

1721 - خَيْل کے لیے [دیکھو نمبر: 385]۔ بِغَال۔ بَغْلٌ کی جمع ہے خچر۔ حَمِيْر حِمَارٌ کی جمع ہے گدھا۔ ان کا الگ ذکر کیا اس لیے کہ یہ سواری کا کام دیتے ہیں اور اونٹ گائے بکری وغیرہ سے دوسری قسم کے فوائد زیادہ ہیں۔ اور جب ان پر سواری کا ذکر کیا تو ساتھ ہی بڑھایا کہ اللہ تعالیٰ ایسی چیزیں بھی پیدا کرتا ہے اور کرے گا جنہیں تم جانتے نہیں اور اس میں بالخصوص سواری کی ان چیزوں کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے جو ابھی ظاہر ہونے والی تھیں اور دوسری جگہ فُلْكٌ یعنی کشتی کا ذکر کر کے جس سے سواری کا کام لیا جاتا ہے فرمایا ﴿وَ خَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا يَرْكَبُوْنَ ۝۴۲﴾ [يٰسٓ: 42:36] ''اور ان کے لیے اس جیسا کچھ اور پیدا کیا ہے جس پر وہ سوار ہوتے ہیں۔'' یعنی کشتی کی مثل سواری کی اور چیزیں بھی پیدا کریں گے۔ اور عام بھی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی ایسی ایسی مخلوق ہے جس کا انسان کو علم بھی نہیں۔

1722 - ﴿قَصْدُ﴾۔ [دیکھو نمبر: 854] قَصْدٌ کے معنی رستہ کی استقامت یا سیدھا ہونا ہیں۔ اور یہاں مصدر بمعنی فاعل ہے یعنی استقامت والا رستہ یا سیدھا رستہ۔

﴿جَآئِرٌ﴾ اس کی اصل جَوَارٌ بمعنی قرب سے ہے اس لیے [جَارَ عَنِ الطَّرِيْقِ] اصل میں بلحاظ قرب ہی بولا جاتا ہے۔ پھر ہر ایک حق سے پھرنے کا نام ہو گیا جس سے جَوْرٌ بمعنی ظلم ہے اور جَائِرٌ کے معنی سیدھے رستہ سے پھرنے والا ہیں۔ (غ)

جسمانی سامانوں کے مقابلہ پر روحانی سامان:

جب انسان پر اپنی جسمانی نعمتوں کا ذکر کیا کہ ہم نے کیا کیا سامان اس کے لیے بنا رکھے ہیں تو اب اس طرف توجہ دلائی کہ کیا ضروری نہ تھا کہ جس نے اس قدر سامان جسمانی آسائش کے لیے بنائے ہیں وہ اخلاق اور روحانیت کے لیے بھی کوئی رستہ دکھاتا۔ اس لیے فرمایا کہ سیدھے رستہ کی طرف ہدایت کرنا بھی اللہ تعالیٰ کا ہی کام تھا اور اسی غرض کے لیے وہ وحی بھیجتا ہے۔ ہاں لوگ خود بھی رستہ تراش لیتے ہیں مگر یہ سیدھی راہیں نہیں۔ بلکہ طریق مستقیم سے ایک طرف پھیر دینے والی ہیں۔

هُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّ مِنْهُ شَجَرٌ فِیْهِ تُسِیْمُوْنَ ۝۱۰

وہی ہے جو تمہارے لیے بادل سے پانی اتارتا ہے اس سے پینے کے کام آتا ہے اور اس سے درخت (پرورش پاتے) ہیں جن میں تم چراتے ہو۔

یُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَ الزَّیْتُوْنَ وَ النَّخِیْلَ وَ الْاَعْنَابَ وَ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ۝۱۱

اسی سے وہ تمہارے لیے کھیتی اگاتا ہے اور زیتون اور کھجور اور انگور اور ہر قسم کے پھل۔ یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے نشان ہے جو فکر کرتے ہیں۔

وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَ النَّهَارَ ۙ وَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ؕ وَ النُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۙ۝۱۲

اور اس نے تمہارے لیے رات اور دن کو اور سورج اور چاند کو کام میں لگا رکھا ہے اور ستارے بھی اس کے حکم سے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

وَ مَا ذَرَاَ لَكُمْ فِی الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّذَّكَّرُوْنَ ۝۱۳

اور جو کچھ اس نے تمہارے لیے زمین میں پیدا کیا ہے اس کے مختلف رنگ ہیں۔ یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے نشان ہے جو نصیحت حاصل کرتے ہیں۔ (1723)

1723 - اَلْوَان۔ لَوْنٌ کے معنی رنگ ہیں لیکن اَلْوَانٌ سے بعض وقت اجناس اور انواع بھی مراد لی جاتی ہیں مثلاً [اَتٰی بِالْاَلْوَانِ مِنَ الْاَحَادِیْثِ] کے معنی ہیں طرح طرح کی باتیں کیں۔ (غ) یہاں بھی نعمتوں کے مختلف انواع مراد ہیں۔ رنگوں کے اختلاف کی طرف دوسری جگہ توجہ دلائی ہے ﴿اخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَ اَلْوَانِكُمْ﴾ [الروم: 22:30] ''تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں کا اختلاف ہے۔''

ان تمام نعمائے الٰہی کے ذکر میں ان کے پیدا کرنے والے کی طرف توجہ دلائی ہے کہ کس طرح زمین کے رنگ اور آسمان کے ستارے یکساں انسان کے لیے فائدے کا موجب ہو رہے ہیں۔ یہ کام نہ عیسیٰ مسیح کا ہے جسے عیسائیوں نے خدا بنایا، نہ رام چندر اور کرشن جی کا جن کو ہندوؤں نے خدائی کا مرتبہ دیا نہ کسی بت کا جسے بت پرست پوجتے ہیں۔ بلکہ یہ بھی بتا دیا کہ اس سورج

وَ هُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِیًّا وَّ تَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْیَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَ تَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِیْهِ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۴﴾

اور وہی ہے جس نے سمندر کو کام میں لگا رکھا ہے تاکہ تم اس سے تازہ گوشت کھاؤ اور اس سے (موتیوں کے) زیور نکالو جنہیں تم پہنتے ہو اور تُو کشتیوں کو دیکھتا ہے اسے پھاڑتی چلی جاتی ہیں تاکہ تم اس کا فضل طلب کرو اور تاکہ تم شکر کرو۔ (1724)

وَ اَلْقٰى فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِكُمْ وَ اَنْهٰرًا وَّ سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵﴾

اور اس نے زمین میں پہاڑ ڈالے تاکہ وہ تمہیں کھانے کا سامان دیں اور دریا اور راستے (بنائے) تاکہ تم ہدایت پاؤ۔ (1725)

اور چاند کو بھی کسی نے کام میں لگا رکھا ہے اور قید میں جکڑ رکھا ہے۔ **ان تمام چیزوں کی حد بندیاں بتاتی ہیں کہ کوئی حد بندی کرنے والا بھی ہے** اور یہ سارا نظم ظاہر کرتا ہے کہ کوئی اس نظام کو وجود میں لانے والا بھی ہے۔

1724- طَرِیّ۔ تازہ۔ اسی سے طراوت ہے اور [لَحْمًا طَرِیًّا] سے مراد مچھلی کا گوشت ہے۔

﴿حِلْیَةً تَلْبَسُوْنَهَا﴾ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن شریف عورتوں اور مردوں کو یکساں مخاطب کرتا ہے۔ زیورات تو عورتیں پہنتی ہیں ﴿اَوَ مَنْ یُّنَشَّؤُا فِی الْحِلْیَةِ﴾ [الزخرف: 43:18] ''کیا وہ جو زیور میں پرورش پائے۔'' اور یہاں حِلْیَةً سے مراد موتی وغیرہ ہیں۔

﴿مَوَاخِرَ﴾۔ مَاخِرَةٌ کی جمع ہے اور [مُؤْخَرَةُ السَّفِیْنَةُ] کشتی کے پانی کو چیرنے پر بولا جاتا ہے۔

سمندر کا مسخر ہونا یہ ہے کہ کشتیوں کے ذریعہ سے انسان اس پر حکمرانی کرتا ہے اور طرح طرح کے فوائد حاصل کرتا ہے اللہ تعالیٰ نے تو چیزوں کو لگا رکھا ہے مگر انسان جدوجہد کے بغیر ان سے منافع حاصل نہیں کرسکتا۔

1725- ﴿تَمِیْدَ﴾۔ [مَادَ یَمِیْدُ] کے لیے [دیکھو نمبر: 890] اور مَیْدَ کے معنی [اِضْطِرَابُ الشَّیْءِ الْعَظِیْمُ] بھی ہیں یعنی عظیم الشان چیز کا اضطراب۔ جیسے زمین کا اضطراب۔ (غ) اور مَادَ کے معنی یہ بھی ہیں کہ ایک چیز ایک طرف مائل ہوگئی اور یہ بھی کہ کچھ دوسرے کو دیا۔ اور ﴿اَنْ تَمِیْدَ بِكُمْ﴾ کے معنی دونوں طرح ہوسکتے ہیں یعنی یہ کہ وہ تمہیں کھانے کا سامان دے اور یہ بھی کہ وہ اضطراب سے رک جائے اور پہلے معنی ترجمہ میں اَنْهٰرًا کی مناسبت سے اختیار کیے گئے ہیں۔ کیونکہ اگر پہاڑ نہ ہوتے تو دریا بھی نہ ہوتے اور انسان کی روزی کے سامان کا انحصار پہاڑوں اور دریاؤں پر ہی ہے اور یہ امر کہ پہاڑ اور دریا دونوں

وَعَلٰمٰتٍ ؕ وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۶﴾

اور بڑے بڑے نشان اور ستاروں سے وہ راہ پاتے ہیں۔

اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۷﴾

تو کیا جو پیدا کرتا ہے وہ اس کی طرح ہے جو پیدا نہیں کرتا۔ سو کیوں تم نصیحت حاصل نہیں کرتے۔ (1726)

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸﴾

اور اگر اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو انہیں گن نہ سکو گے یقیناً اللہ حفاظت کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔ (1727)

ع 2 12 8

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ﴿۱۹﴾

اور اللہ جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو اور جو تم ظاہر کرتے ہو۔

وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ﴿۲۰﴾ ؕ

اور وہ جنہیں یہ اللہ کے سوائے پکارتے ہیں وہ کوئی چیز پیدا نہیں کرتے اور وہ خود پیدا کیے گئے ہیں۔

یہاں ﴿اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ﴾ کے حکم میں ہیں اس سے ظاہر ہے کہ اَنْہَارَ کو سُبُل کے ساتھ نہیں لگایا جا سکتا کیونکہ دریا رستوں کا کام نہیں دیتے۔ اور حدیث میں جو آیا ہے کہ [لَمَّا خَلَقَ اللّٰهُ الأَرْضَ جَعَلَتْ تَمِيدُ فَجَعَلَ الْجِبَالَ] (تفسیر ابن ابی حاتم، جلد8، صفحہ 489) یعنی **جب اللہ تعالیٰ نے زمین کو پیدا کیا تو اس میں بہت اضطراب تھا۔ تب اللہ تعالیٰ نے پہاڑ قائم کیے**۔ سو یہ بالکل درست ہے اور سائنس بھی اس پر شاہد ہے کہ پہاڑوں کے بن جانے سے زمین کا اضطراب زلزلوں کے رنگ میں کم ہو گیا۔

1726 - انسان کے لیے ان بے شمار نعمتوں کے خلق کا ذکر کر کے اب فرماتا ہے کہ یہ سب نعمتیں پیدا کرنے والا اور وہ جو پیدا نہیں کرتا کیا یہ دونوں یکساں ہیں۔ ﴿اَفَمَنْ يَّخْلُقُ﴾ صرف ذات باری ہے ﴿لَهُ الْخَلْقُ﴾ ﴿خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ﴾ اور ﴿لَا يَخْلُقُ﴾ کل معبودان باطل ہیں۔ اور چونکہ دلیل عبادت خلق ہے پس جنہوں نے پیدا نہیں کیا وہ معبود بھی نہیں ہو سکتے اور یہ بھی سمجھایا کہ جو چیزیں تمہارے ہی فائدہ کے لیے پیدا کی گئی ہیں ان سے بجائے کام لینے کے انہیں اپنا معبود بناتے ہو۔

1727 - اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے ذکر کے بعد غفور اور رحیم کی صفات کا اس لیے ذکر کیا کہ **انسان بہتیری نعمتوں کی ناشکر گزاری بھی کرتا ہے** اور ان کی پروا نہیں کرتا۔ اس پر اللہ تعالیٰ اپنے غفر سے کام لیتا ہے اور جس نعمت سے فائدہ اٹھاتا ہے اس پر صفت رحیمیت نتیجہ مترتب فرماتی رہتی ہے۔ اگلی آیت میں ﴿مَا تُسِرُّوْنَ﴾ وہی نعمتیں ہیں جن سے انسان فائدہ نہ اٹھا کر انہیں گویا چھپاتا ہے اور ﴿مَا تُعْلِنُوْنَ﴾ وہ جن کا وہ اپنے عمل سے اظہار کرتا ہے۔

اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ ۚ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ ۙ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴿۲۱﴾

مردے ہیں نہ زندہ اور وہ نہیں جانتے کہ کب اٹھائے جائیں گے۔ (1728)

اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّ هُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۲۲﴾

تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے سو جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے ان کے دل انکاری ہیں اور وہ تکبر کرتے ہیں۔ (1729)

1728 - یہ دونوں آیتیں بتاتی ہیں کہ وہ انسان جن کو لوگ خدا کر کے پکارتے تھے وہ مر چکے تھے کوئی ان میں سے زندہ نہ تھا اور نہ ان کو یہ علم تھا کہ وہ خود کب اٹھائے جائیں گے۔ ان باتوں کا ذکر کیوں فرمایا؟ اس لیے کہ اوپر فرمایا تھا کہ وہ جو پیدا کرتا ہے اس کی طرح نہیں ہوسکتا جو پیدا نہیں کرسکتا اور چونکہ وہ انسان جنہیں خدا بنایا گیا ان کے متعلق بھی خود ان کے پرستاروں کو یہ اعتراف ہے کہ انہوں نے پیدا کچھ نہیں کیا۔ اس لیے یوں اتمام حجت کر کے اب بتایا کہ انہوں نے نہ صرف کچھ پیدا ہی نہیں کیا بلکہ وہ خود مخلوق ہیں اور مخلوق کی جو حالت ہوتی ہے وہ ان پر آئی یعنی وہ مر گئے اور بعثت چونکہ دوسری پیدائش کا نام ہے اس لیے فرمایا کہ جب انہیں پہلی خلق میں کچھ حصہ نہیں تو دوسری میں بھی نہیں۔ **ان آیات سے یہ یقینی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جن کو انسانوں کے ایک بڑے حصہ نے خدا بنایا ہے وہ بھی اس آیت کے نزول کے وقت مردوں میں داخل تھے۔** اموات کے بعد ﴿غَيْرُ اَحْيَآءٍ﴾ تاکید کے طور پر لایا گیا ہے۔ کیونکہ اموات سے یہ مراد بھی ہوسکتی ہے تھی کہ آئندہ کبھی ان پر موت آجائے۔ اس لیے فرمایا کہ نہیں وہ اس وقت بھی زندہ نہیں۔ عیسائیوں کا یہ اعتراض کہ روح القدس جو جبریل کا نام ہے وہ ﴿اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ﴾ میں داخل نہیں اس لیے غلط ہے کہ اول عیسائیوں کے نزدیک روح القدس جبریل کا نام نہیں بلکہ وہ ایک فرضی اقنوم ہے۔ اور دوسرے یہاں انسانوں کا ذکر ہے جنہیں خدا بنایا گیا۔ کیونکہ یہاں بعثت کا ذکر ہے اور بعثت صرف انسانوں کے لیے ہے اور تیسرے روح القدس سے عیسائی دعائیں نہیں مانگتے، جس طرح مسیح سے مانگتے ہیں۔

1729 - ﴿مُّنْكِرَةٌ﴾۔ انکار جو ضد عرفان ہے۔ اصل اس کی یہ ہے کہ دل پر کوئی بات وارد ہو جسے وہ تصور میں نہیں لاسکتا اور یہ ایک قسم کی جہالت ہے۔ (غ) یہاں مراد ہے: [مُنْكِرَةٌ لِلْوَحْدَانِيَةِ] (ر)

پہلے رکوع میں صحیفۂ قدرت سے وحی الٰہی پر اور دوسرے میں توحید پر دلائل دیئے تھے۔ اب دونوں باتوں کو ملا کر فرماتا ہے کہ **جو لوگ زندگی بعد الموت کو نہیں مانتے ان کے دل درحقیقت توحید الٰہی سے بھی انکاری ہیں**۔ گویا وہ توحید الٰہی کی حقیقت کو بھی نہیں پہچانتے۔ یوں برائے نام اللہ تعالیٰ کی ہستی کا اقرار کرتے ہیں اور متکبر ان کو اس لحاظ سے کہا کہ وہ اعمال کی ذمہ داری نہیں سمجھتے۔

لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَ مَا يُعْلِنُوْنَ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ ﴿۲۳﴾

حق یہی ہے کہ اللہ جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں۔ وہ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ (1730)

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ مَّاذَاۤ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۙ قَالُوْۤا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۴﴾ۙ

اور جب انہیں کہا جاتا ہے تمہارے رب نے کیا اتارا ہے کہتے ہیں پہلوں کی کہانیاں۔

لِيَحْمِلُوْۤا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۙ وَ مِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ ﴿۲۵﴾ ع

کہ اپنے بوجھ قیامت کے دن پورے اٹھائیں گے اور ان کے بوجھوں سے بھی جنہیں علم کے بغیر گمراہ کرتے ہیں۔ سنو! برا بوجھ ہے جو وہ اٹھاتے ہیں۔ (1731)

قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَ اَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۲۶﴾

انہوں نے بھی (حق کے خلاف) تدبیریں کیں جو ان سے پہلے تھے سو اللہ نے ان کی عمارت کو بنیادوں سے گرایا، سو چھت ان کے اوپر سے ان پر آ گری اور عذاب ان پر آ پہنچا جہاں سے انہیں خیال نہ تھا۔ (1732)

1730 - ﴿لَا جَرَمَ﴾۔ جَرَمَ کے معنی ہیں گناہ کمایا۔ اور ﴿لَا جَرَمَ﴾ محاورہ کے طور پر اسی طرح استعمال ہوتا ہے جیسے [لَا بُدَّ، لَا مَحَالَةَ]۔ اور اس کے معنی ہیں کہ حق یوں ہی ہے۔ (ل)

1731 - ﴿لِيَحْمِلُوْۤا﴾ میں لام عاقبت کا ہے یعنی ان کے ایسی باتیں کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ خود بھی گمراہ ہوتے چلے جاتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ وحی الٰہی کو جو انسان کے اعمال کی ذمہ داری کی طرف توجہ دلاتی ہے اور بتاتی ہے کہ کوئی عمل بے نتیجہ نہیں رہے گا کہانیاں کہنے کا یہ نتیجہ ہے کہ اصلیت پر غور نہیں کرتے، گمراہی میں بڑھتے چلے جاتے ہیں اور ﴿كَامِلَةً﴾ اس بوجھ کو اسی لحاظ سے کہا کہ جس حد تک یہ بڑھ سکتا تھا انہوں نے اسے بڑھایا۔

1732 - **خلاف حق تدابیر کا انجام**: جب یہ بتایا کہ توحید الٰہی کا علم درحقیقت وحی الٰہی سے ہی آتا ہے تو اب ان لوگوں کا ذکر کیا جو

ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُخْزِيْهِمْ وَ يَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تُشَآقُّوْنَ فِيْهِمْ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَ السُّوْٓءَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۙ﴿۲۷﴾

پھر قیامت کے دن انہیں رسوا کرے گا اور کہے گا میرے شریک کہاں ہیں جن میں تم (حق کی) مخالفت کرتے تھے، جنہیں علم دیا گیا ہے کہیں گے آج کی رسوائی اور خرابی کافروں پر ہے۔ (1733)

الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۠ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۸﴾

جن کی جانیں فرشتے قبض کرتے ہیں (درآنحالیکہ) وہ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں۔ تب وہ فرمانبرداری ظاہر کریں گے (کہیں گے) ہم کوئی بدی نہیں کرتے تھے، ہاں اللہ خوب جانتا ہے جو تم کرتے تھے۔ (1734)

فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۲۹﴾

سو دوزخ کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ اسی میں رہو گے۔ یقیناً متکبروں کا ٹھکانا بہت برا ہے۔

وَ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ؕ قَالُوْا خَيْرًا ؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ

اور جو تقویٰ کرتے ہیں انہیں کہا جاتا ہے تمہارے رب نے کیا اتارا؟ کہتے ہیں بھلائی۔ جو لوگ نیکی کرتے ہیں ان

اس عظیم الشان امر حق کی مخالفت میں تدبیریں کر کے اسے نیست و نابود کرنا چاہتے تھے اور اس آیت میں سمجھایا ہے کہ ان کی تمام تدابیر بمنزلہ ایک بڑی عمارت کے ہیں جس کی بنیادوں کو اللہ تعالیٰ کھوکھلا کر دے گا اور بجائے اس کے کہ اس عمارت سے حق کو نقصان پہنچے یہ خود ہی ان تدابیر سے نقصان اٹھائیں گے۔ بُنْيَانٌ سے مراد یہاں ان کی تدابیر کی عمارت ہے۔ [دیکھو نمبر: 1350]

1733 - ﴿الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ﴾ اول انبیاء علیہم السلام پھر ان کے حقیقی متبع ہیں۔ وہ قیامت کو بھی ایسا کہیں گے اس دنیا میں بھی کہتے ہیں۔

1734 - سَلَمَ کے معنی اِسْتِسْلَامٌ یا فرمانبرداری یا اطاعت ہیں گویا اس دن کہیں گے کہ ہم تو فرمانبرداری ہی کرتے تھے اور کوئی برا کام نہیں کرتے تھے۔ گویا جھوٹے عذر پیش کریں گے جیسا دوسری جگہ ہے ﴿وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ﴾ [الأنعام: 23:6] ''اللہ ہمارے رب کی قسم ہم مشرک نہ تھے۔''

الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ؕ وَ لَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ؕ وَ لَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ ۙ﴿۳۰﴾

کے لیے اس دنیا میں بھی بھلائی ہے اور آخرت کا گھر یقیناً بہتر ہے اور متقیوں کا گھر کیا ہی اچھا ہے۔ (1735)

جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ ؕ كَذٰلِكَ يَجْزِي اللّٰهُ الْمُتَّقِيْنَ ۙ﴿۳۱﴾

ہمیشگی کے باغ جن میں داخل ہوں گے ان کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان کے لیے ان میں ہے جو کچھ وہ چاہیں۔ اسی طرح اللہ متقیوں کو جزا دیتا ہے۔

الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ۙ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۳۲﴾

جن کی جانیں فرشتے قبض کرتے ہیں (درآنحالیکہ) وہ پاک ہیں کہتے ہیں تم پر سلامتی ہو جنت میں داخل ہو جاؤ، اس کا بدلہ جو تم کرتے تھے۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ وَ مَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَ لٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۳۳﴾

وہ سوائے اس کے اور کچھ انتظار نہیں کرتے کہ ان پر فرشتے آ جائیں یا تیرے رب کا حکم آ جائے۔ اسی طرح انہوں نے کیا جو اِن سے پہلے تھے اور اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ اپنی جانوں پر آپ ہی ظلم کرتے تھے۔ (1736)

فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَ حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۳۴﴾ ع 4 9 10

سو جو وہ عمل کرتے تھے اسی کی برائیاں ان پر آئیں اور اسی نے انہیں آ لیا جن پر وہ ہنسی کرتے تھے۔

1735 – ان دونوں رکوعوں کا مضمون ایک ہونا اس سے ظاہر ہے کہ پچھلے رکوع میں یہی سوال کفار پر ہے کہ تمہارے رب نے کیا نازل کیا ہے تو وہ کہتے ہیں یوں ہی قصے ہیں ماننے کے قابل باتیں نہیں [24] یہاں وہی سوال مومنوں سے ہے۔ تو وہ جواب دیتے ہیں کہ وحی الٰہی انسانوں کی بھلائی کے سامان اپنے اندر رکھتی ہے۔ سو اللہ تعالیٰ ان کو دنیا کی بھی اور آخرت کی بھی بھلائی عطا فرماتا ہے۔ طَیِّبْ کے معنی پر [دیکھو نمبر: 574]۔

1736 – اس کے معنی پر بحث [نمبر: 269] میں گزر چکی۔ یہاں آخر پر فرمایا کہ ایسے حالات میں عذاب ان پر آئے تو وہ اللہ تعالیٰ کی

وَ قَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ نَّحْنُ وَ لَاۤ اٰبَآؤُنَا وَ لَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۳۵﴾

اور جو شرک کرتے ہیں وہ کہتے ہیں اگر اللہ چاہتا تو ہم اس کے سوائے کسی چیز کی عبادت نہ کرتے (نہ) ہم اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم اس کے (حکم کے) سوائے کوئی چیز حرام ٹھہراتے، اسی طرح انہوں نے کیا جو اِن سے پہلے تھے۔ سو رسولوں پر سوائے کھول کر پہنچا دینے کے اور کوئی ذمہ داری نہیں۔

وَ لَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَ مِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ ؕ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۳۶﴾

اور یقیناً ہم نے ہر ایک قوم میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور شیطان سے بچو۔ سو ان میں سے کوئی ایسا تھا جسے اللہ نے ہدایت دی اور کوئی ان میں سے ایسا تھا جس پر گمراہی ثابت ہوئی، سو زمین میں چلو پھر دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیسا ہوا؟[1737]

طرف سے ظلم نہیں بلکہ ان کا اپنا ظلم اپنی جانوں پر ہے۔

1737 - ان دو آیتوں میں باطل پرستوں کے اس عذر باطل کا فیصلہ کیا ہے کہ اللہ چاہتا تو ہم ایسا نہ کرتے۔ گویا اللہ ہی یہ چاہتا ہے کہ لوگ شرک کریں۔ اگر وہ یہ چاہتا کہ شرک نہ کریں تو انہیں روک دیتا۔ اس کا جواب دیا ہے کہ اللہ تو رسولوں کو اسی لیے بھیجتا ہے کہ لوگ شرک سے بچیں ﴿فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۳۵﴾﴾ لیکن رسولوں کا کام صرف پیغام کو پہنچا دینا ہے وہ جبراً نہیں روکتے۔ اگر اس کا ہی منشا یہ ہوتا کہ لوگ شرک کریں تو پھر وہ رسولوں کو شرک کے خلاف تعلیم دے کر کیوں بھیجتا۔ پھر [آیت:36] میں اس کو اور تقویت دی کہ ہم نے ہر قوم میں رسول بھیجے کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے یعنی غیر اللہ کی پرستش سے بچو۔ پھر اس تعلیم کے آنے پر دو گروہ ہو جاتے ہیں۔ ایک وہ جنہیں اللہ ہدایت دے دیتا ہے یعنی وہ ہدایت قبول کر لیتے ہیں اور دوسرے وہ جن پر ضلالت یعنی گمراہی ثابت ہو جاتی ہے۔ اب اس دوسرے فریق کے متعلق فرمایا کہ ان پر گمراہی ثابت ہو جاتی ہے۔ یعنی ان کی تکذیب اور مخالفت حق اس حد کو پہنچ جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ان افعال کی وجہ سے ان پر گمراہ ہونے کا فتویٰ لگا دیتا ہے۔ چنانچہ آیت کے آخر پر مکذبین کا ذکر کر کے اسے صاف کر دیا کہ وہ خود تکذیب حق میں یہاں تک بڑھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر بطور سزا یہ حکم لگ جاتا ہے اور یہ وہ حالت ہوتی ہے جب انسان کو اپنے ان برے

اِنْ تَحْرِصْ عَلٰى هُدٰىهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِىْ مَنْ يُّضِلُّ وَ مَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۳۷﴾

اگر تو ان کی ہدایت کی آرزو کرتا تو اللہ اسے ہدایت نہیں دیتا جس پر وہ گمراہی کا فتویٰ لگا دیتا ہے اور ان کے لیے کوئی مددگار نہیں ہوں گے۔ (1738)

وَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ لَا يَبْعَثُ اللّٰهُ مَنْ يَّمُوْتُ ؕ بَلٰى وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وَّ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۸﴾

اور اللہ (تعالیٰ) کی قسم کھاتے ہیں سخت ترین قسم کہ جو کوئی مرجاتا ہے اللہ اسے نہیں اٹھائے گا ہاں یہ وعدہ ہے سچا جو اس کے ذمہ ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِىْ يَخْتَلِفُوْنَ فِيْهِ وَ لِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰذِبِيْنَ ﴿۳۹﴾

تاکہ ان پر وہ باتیں کھول دے جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں اور تاکہ جو کافر ہیں وہ جان لیں کہ وہ جھوٹے تھے۔

اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَىْءٍ اِذَاۤ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ

ہمارا فرمان کسی چیز کے لیے جب ہم اس کا ارادہ کریں

افعال سے آہستہ آہستہ اس قدر پیار ہو جاتا ہے کہ وہ گویا اس کی طبیعت کا جزو ہو جاتے ہیں [دیکھو نمبر: 41]۔ اسی لیے اگلی آیت میں یہ لفظ اختیار فرمائے ہیں ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِىْ مَنْ يُّضِلُّ﴾ یعنی جب یہاں تک نوبت پہنچ جاتی ہے تو پھر وہ ہدایت سے بہت دور جا پڑتا ہے۔ اس لیے اللہ اسے ہدایت نہیں دیتا۔ اور جو بعض جگہ ایسے لفظ آ جاتے ہیں جیسے ﴿وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَاۤ اَشْرَكُوْا﴾ [الأنعام: 107:6] ''اور اگر اللہ چاہتا تو وہ شرک نہ کرتے۔'' یا ﴿فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ﴾ [الأنعام: 149:6] ''سو اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دیتا۔'' تو ان کا مفہوم بھی اسی کے مطابق ہے۔ کیونکہ مطلب یہاں بھی یہی ہے کہ ہم نے انسان کو اختیار دیا ہے کہ وہ ایک راہ اختیار کرے یا دوسری یعنی اس کی مشیت یہی ہے کہ انسان مجبور محض نہ ہو، نہ وہ شرک پر مجبور ہے، نہ اللہ تعالیٰ اسے ہدایت پر مجبور کرتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے انسان کو مجبور ہی کرنا ہوتا تو وہ ہدایت پر مجبور کرتا۔ جیسے دوسری مخلوق کو کیا۔ شرک پر کسی صورت میں مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ پس ماحصل دونوں کے الفاظ کا ایک ہے۔

1738 - ﴿مَنْ يُّضِلُّ﴾ کے ایک معنی وہ ہیں جو ترجمہ میں اختیار کیے گئے ہیں اور جن کی تشریح اوپر گزر چکی۔ اور دوسرے معنی یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ اللہ اسے ہدایت نہیں دیتا جو دوسروں کو گمراہ کرتا ہے اور مآل ایک ہے۔ اس لیے کہ ایک شخص کی جب گمراہی سے محبت ترقی کر کے اس کی طبیعت کا جزو ہو جاتی ہے تو پھر وہ دوسروں کو بھی گمراہ کرنا شروع کرتا ہے۔

ع 5/6 11 لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۴۰﴾ ع

صرف یہی ہوتا ہے کہ ہم اسے کہہ دیں ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔(1739)

وَ الَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ؕ وَ لَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾ ۙ وقف لازم

اور جن لوگوں نے اس کے بعد جو ان پر ظلم کیا گیا اللہ کے لیے ہجرت کی ہم ضرور انہیں دنیا میں اچھی جگہ دیں گے اور آخرت کا بدلہ تو بڑا ہے کاش وہ جانتے۔(1740)

الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۴۲﴾

جنہوں نے صبر کیا اور وہ اپنے رب پر ہی بھروسہ کرتے ہیں۔

وَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْۤ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْۤا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۳﴾ ۙ

اور ہم نے تجھ سے پہلے مرد ہی بھیجے تھے جن کی طرف ہم وحی کرتے تھے۔تو اہل ذکر سے پوچھ لو اگر تم نہیں جانتے۔(1741)

1739 - ان کے عذر باطل کا فیصلہ کر کے اب ان کی اصل بیماری کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ انہیں آخرت پر ایمان نہیں اور اللہ تعالیٰ کو وہ اس بات پر قادر نہیں جانتے کہ موت کے بعد وہ انہیں پھر زندہ کرے۔اس لیے آخر پر فرمایا کہ اس کے حکم سے پہلے بھی خلق ہوئی ہے،اسی کے حکم سے دوبارہ بھی ہو جائے گی۔

1740 - **دکھوں کے وقت کامیابی کی بشارت:** اس آیت میں جو ہجرت کا ذکر ہے تو اس سے دونوں ہجرتوں کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے۔یعنی پہلی ہجرت جو ملک حبش کی طرف ہوئی اور دوسری ہجرت جو مدینہ کی طرف ہوئی۔کیونکہ مدینہ کی ہجرت بھی نبی کریم ﷺ کی مکہ میں موجودگی میں ہی شروع ہو گئی تھی اور آپ ﷺ نے سب سے آخر ہجرت کی۔ان لوگوں کو جو اس بے سروسامانی میں اپنے گھروں سے نکلے اور جن کی کوئی بڑی تعداد بھی نہ تھی اتنی بڑی بشارت کہ ہم انہیں دنیا میں بھی اچھی جگہ دیں گے،قرآن کریم کی ان بے نظیر پیشگوئیوں میں سے ایک ہے جن کے سامنے سخت سے سخت معاند کو بھی سر جھکانا پڑتا ہے۔ یہ مکی سورت ہے،مکہ میں اس کا اعلان ہوتا ہے اور ان لوگوں کے متعلق جو کسمپرسی کی حالت میں کفار کے ہاتھ دکھ اٹھا کر بھاگے جا رہے ہیں یہ با آواز بلند ان کے مخالفین کو سنایا جاتا ہے کہ ان کا استیصال نہیں ہوگا جیسا کہ تم نے گمان کر لیا ہے۔بلکہ ان کو دنیا میں ہی مقامات بلند عطا ہوں گے۔سارا ملک چند نفوس کے استیصال کے درپے ہو یہ کسی کے وہم میں بھی نہ آ سکتا تھا کہ یہی چند نفوس اس دنیا میں بھی اعلیٰ مقامات پر پہنچیں گے۔اس قسم کی پیشگوئیوں کے پورا ہونے نے ہی ملک عرب کو آخر آنحضرت ﷺ کے سامنے جھکا دیا۔

1741 - ذِکْرٌ کے لیے [دیکھو نمبر: 191 و1047] وغیرہ۔الذِّکْر قرآن کریم کا نام خصوصیت سے ہے اور ہر ایک وحی کو بھی کہا جا سکتا ہے۔

بِالْبَيِّنٰتِ وَ الزُّبُرِ ؕ وَ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۴۴﴾

کھلی دلائل اور کتابوں کے ساتھ (انہیں بھیجا) اور ہم نے تیری طرف ذکر بھیجا ہے تاکہ تو لوگوں کے لیے کھول کر بیان کر دے جو ان کی طرف اتارا گیا ہے اور تاکہ وہ فکر سے کام لیں۔

اَفَاَمِنَ الَّذِيْنَ مَكَرُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّخْسِفَ اللّٰهُ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۴۵﴾

تو کیا وہ جو برائی کی تدبیریں کرتے ہیں اس بات سے نڈر ہو گئے ہیں کہ اللہ ان کو ملک میں ذلیل کر دے یا ان پر ایسی طرف سے عذاب آ جائے جس کا انہیں خیال بھی نہیں۔ (1742)

اس لیے ﴿اَهْلَ الذِّكْرِ﴾ سے مراد اہل کتاب بھی ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ سوال صرف اس قدر ہے کہ انسان ہی ہمیشہ رسول ہو کر آتے رہے یا نہیں اور مسلمان بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ اصل غرض صرف ان پر اتمام حجت ہے۔ یعنی تم ان باتوں کو جانتے تو ہو لیکن اگر نہیں جانتے تو اہل علم سے پوچھ لو۔ اور اگلی آیت میں قرآن شریف کا یہی نام الذِّكْرَ لے کر اسی دوسرے معنی کی تائید کی ہے۔

عورت کی نبوت:

رجال کا لفظ یہاں آنے پر یہ بحث ہوئی ہے کہ اس آیت کی تصریح کے بموجب عورت رسول تو نہیں ہو سکتی مگر آیا وہ نبی بھی ہو سکتی ہے یا نہیں۔ روح المعانی میں ہے کہ عورتوں کی نبوت کے صحیح ہونے کی ایک جماعت قائل ہے۔ سو اصل یہ ہے کہ اس نبوت سے مراد محض اللہ تعالیٰ کی ہمکلامی ہے یعنی نبوت اپنے لغوی معنی میں جس کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے جاری ہے، لیکن اصطلاح شرعی میں نبوت چونکہ ماموریت کو چاہتی ہے اس لیے وہ رسالت سے الگ نہیں ہو سکتی اور اس لیے اصطلاح شریعت میں نبوت عورتوں کو نہیں ملتی۔

1742 - ﴿يَّخْسِفَ﴾۔ خُسُوْف چاند کی اور کُسُوْف سورج کی روشنی کے جاتے رہنے کا نام ہے اور [عَيْنٌ خَاسِفَةٌ] وہ چشمہ ہے جو غائب ہو جائے اور خَسَفَ کا استعمال استعارۃً ذلت پر بھی ہوتا ہے۔ (غ) اور خَسْف کے معنی ہذال اور ذلت اور اِذْلَالٌ یعنی کسی کو ذلیل کرنا بھی آتے ہیں اور [خَسَفَ بِهِ الْاَرْضَ] کے معنی ہیں اسے زمین میں غائب کر دیا۔ (ل)

اس آیت میں **آنحضرت ﷺ کے مخالفین کے عذاب کا ذکر** ہے۔ اور سب سے پہلے ان کے خسف کا ذکر کیا۔ اگر خسف سے مراد زمین میں دھنسا نا لیا جائے تو یہ عذاب عام طور پر آپ کے مخالفین پر نہیں آیا۔ ایک آدھ واقعہ جیسے سراقہ کا الگ امر ہے۔

اَوْ يَاْخُذَهُمْ فِيْ تَقَلُّبِهِمْ فَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿۴۶﴾

یا وہ انہیں ان کے آنے جانے میں پکڑ لے تو وہ (اس کی گرفت سے) نہیں نکل سکتے۔

اَوْ يَاْخُذَهُمْ عَلٰى تَخَوُّفٍ ؕ فَاِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۴۷﴾

یا وہ انہیں تھوڑا تھوڑا گھٹا کر پکڑ لے۔ سو تمہارا رب مہربان رحم کرنے والا ہے۔ (1743)

اَوَ لَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ يَّتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ وَ الشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَ هُمْ دٰخِرُوْنَ ﴿۴۸﴾

کیا وہ ہر اس چیز کو نہیں دیکھتے جو اللہ نے پیدا کی ہے اس کے سائے بھی دائیں اور بائیں سے ڈھلتے ہیں اللہ کی فرمانبرداری کرتے ہوئے اور وہ عاجزی کرنے والے ہیں۔ (1744)

لیکن خَسَفَ کے دوسرے معنی یعنی ذلیل کرنا آپ کے مخالفین پر اپنی عمومیت میں صادق آئے ہیں۔ اس لیے وہی معنی یہاں لیے جائیں گے۔

1743 - تَخَوُّفٍ۔ خَوَفَ کے معنی کسی مکروہ امر کی توقع ہیں جو ظنی یا یقینی علامات سے ہوں اور تخویف کے معنی ایسے امور سے بچنے کی تحریص ہیں ﴿ذٰلِكَ يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ﴾ [الزمر: 16:39] ''اس کے ساتھ اللہ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے۔'' ﴿اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ﴾ [آل عمران: 175:3] ''یہ شیطان صرف اپنے دوستوں کو ڈراتا ہے۔'' اور [تَخَوُّفَنَاهُمْ] کے معنی ہیں ہم نے تھوڑا تھوڑا کر کے یعنی تجدریجاً کم کیا جس کا اقتضا خوف ہو اور تخوف کے معنی تنقص ہیں۔ (ل) اور ابن جریر میں اس کے معنی دیئے ہیں کہ ان کو اطراف ونواحی سے تھوڑا تھوڑا کر کے کم کرتا جائے، یہاں تک کہ سب کو ہلاک کر دے۔

ان تین آیات میں عذاب کے تین رنگ بیان کیے ہیں۔ ایک ان پر ذلت وارد کرنا، دوسرے ان کے آنے جانے یا سفروں میں ان کو پکڑنا اور تیسرے تدریجاً انہیں کم کرتے چلے جانا۔ یہاں بڑی صراحت اور صفائی سے اس عذاب کا ذکر ہے جو آپ کے مخالفین پر آنے والا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ عام طور پر ان کی مغلوبیت کا ذکر بہت دفعہ کیا ہے مگر یہاں اس مغلوبیت کی صورتیں بھی بتا دی ہیں اور انہی رنگوں میں سے ایک نہ ایک رنگ میں اہل مکہ پر یہ عذاب آیا۔ ان کے آنے جانے کے ذکر میں ان کے تجارتی سفروں کی طرف اشارہ ہے جو وہ شام کی طرف کرتے تھے، انہی سفروں پر ان کی تجارت اور خوشحالی کا دارومدار تھا اور مسلمانوں کی مدینہ میں موجودگی اسی رنگ میں سب سے بڑھ کر ان کے لیے نقصان دہ ثابت ہوئی۔

1744 - ﴿يَّتَفَيَّؤُا﴾۔ فَيْءٌ کے معنی اچھی حالت کی طرف لوٹ آنا ہیں۔ اور فَاءٌ اور فَيْءٌ اس سایہ پر بولا جاتا ہے جو لوٹ کر آتا ہے یعنی زوال کے بعد۔ (غ) اور تَفَيَّؤُا اس سے باب تفعل ہے۔

وَ لِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۴۹﴾

اور اللہ کی ہی فرمانبرداری کرتے ہیں جو کوئی جاندار آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور فرشتے بھی اور وہ تکبر نہیں کرتے۔ (1745)

يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ﴿۵۰﴾ ع 6 10 12

وہ اپنے رب سے جو ان پر غالب ہے ڈرتے ہیں اور جو کچھ حکم دیا جاتا ہے کرتے ہیں۔ (1746)

وَ قَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۵۱﴾

اور اللہ نے کہا ہے کہ دو معبود مت بناؤ وہ صرف اکیلا ہی معبود ہے۔ سو مجھ ہی سے ڈرتے رہو۔ (1747)

﴿دٰخِرُوْنَ﴾۔ دَخَرَ کے معنی ہیں ذلیل وحقیر ہوا۔ دَاخِرٌ ذلیل ہونے والا۔

سایوں کے سجدہ کرنے کی تشریح [نمبر: 1609] میں گزر چکی۔ یہاں سایوں کے سجدہ کرنے کا ذکر ہے۔ اگلی آیت میں خود ہر چیز کے سجدہ کرنے کا ذکر ہے۔ یہاں کفار کی ذلت کا ذکر کر کے پھر یہ ذکر کیا ہے کہ ہر چیز کے سائے بھی ذلیل ہو کر سجدہ کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت کے سامنے اور اس کے اصل قوانین کے سامنے ہر چیز کو سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے، یہ کافر اس قانون سے باہر نہیں۔

1745 - مَلٰٓئِكَةُ کا عطف دَآبَّةٍ پر بتاتا ہے کہ **فرشتے** الگ قسم کی مخلوق ہیں اور معمولی جانداروں میں شمار نہیں ہوتے۔ دَآبَّةٍ وہ ہیں جنہیں حرکت جسمانی ہے کیونکہ اس کا اصل دَبّ سے ہے جس کے معنی ہلکا چلنا ہیں۔

1746 - ﴿مِنْ فَوْقِهِمْ﴾ میں اللہ تعالیٰ کے ان کے اوپر ہونے سے مراد اس کا قہر اور اس کا غلبہ ہے کیونکہ فوقیت مکانی کی نسبت اس کی طرف نہیں ہو سکتی۔ (ر) اور اس میں بظاہر ملائکہ کی طرف ضمیر جاتی ہے اور ﴿يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ﴾ میں رب کے خوف سے مراد اس کے حکم کی خلاف ورزی کا خوف ہے۔

1747 - **دو خداؤں اور تین خداؤں کا عقیدہ** لوگوں نے علی الاعلان اختیار کیا ہے اور دونوں عقیدوں کی تردید قرآن کریم نے کھلے الفاظ میں کی ہے۔ گو ﴿جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوْرَ﴾ میں بھی اس کی تردید ہو چکی ہے [دیکھو نمبر: 901]۔ مگر یہاں اثْنَيْنِ کا لفظ لا کر یہ صاف کر دیا کہ ثنویہ کا عقیدہ غلط ہے۔ اس کی دلیل ﴿لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ اگلی آیت میں ہے۔ خود فطرت انسانی دو خداؤں کے عقیدہ کو قبول نہیں کر سکتی۔ دو خدا جو ایک دوسرے کے خلاف ہیں ان دونوں سے ایک انسان کس طرح ڈر سکتا ہے۔

وَ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لَهُ الدِّیْنُ وَاصِبًا ؕ اَفَغَیْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ ﴿۵۲﴾

اور اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور فرمانبرداری اسی کی لازم ہے تو کیا اللہ کے سوائے کسی اور کا تقویٰ کرو گے؟(1748)

وَ مَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَیْهِ تَجْـَٔرُوْنَ ﴿۵۳﴾

اور جو کوئی نعمت تمہارے پاس ہے سو اللہ کی طرف سے ہے، پھر جب تمہیں دکھ پہنچتا ہے تو اسی کی طرف تم فریاد لے جاتے ہو۔(1749)

ثُمَّ اِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنْكُمْ اِذَا فَرِیْقٌ مِّنْكُمْ بِرَبِّهِمْ یُشْرِكُوْنَ ﴿۵۴﴾

پھر جب وہ تم سے دکھ دور کر دیتا ہے تو تم میں سے کچھ لوگ اپنے رب کے ساتھ شریک بناتے ہیں۔

لِیَكْفُرُوْا بِمَاۤ اٰتَیْنٰهُمْ ؕ فَتَمَتَّعُوْا ۫ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۵۵﴾

تاکہ اس کی ناشکری کریں جو ہم نے انہیں دیا ہے۔ سو چند روزہ فائدہ اٹھالو آخر جان لو گے۔

وَ یَجْعَلُوْنَ لِمَا لَا یَعْلَمُوْنَ نَصِیْبًا مِّمَّا رَزَقْنٰهُمْ ؕ تَاللّٰهِ لَتُسْـَٔلُنَّ

اور وہ ان کے لیے جو (کچھ) نہیں جانتے اس کا ایک حصہ مقرر کرتے ہیں جو ہم نے انہیں دیا ہے اللہ کی قسم ضرور تم سے اس کے متعلق سوال کیا جائے گا

1748 - ﴿لَهُ الدِّیْنُ وَاصِبًا﴾ دین کے معنی جزا بھی ہیں اور طاعت بھی۔ اور [وَاصِبٌ وَصَبٌ] سے ہے جس کے معنی سقم لازم ہیں۔ اگر دین کے معنی جزا لیے جائیں تو یہ ذکر بطور وعید کے ہے کہ جو شخص دو خدا بناتا ہے اس کی سزا عذاب لازم ہے اور اگر دین بمعنی اطاعت لیا جائے اور یہی قرینہ چاہتا ہے تو وَاصِبٌ کے معنی دائم لیے جائیں گے اور مطلب یہ ہوگا کہ انسان پر یہ لازم ہے کہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرے۔ (غ) یہ بھی فطرت کی شہادت ہے کیونکہ دو آقاؤں کی فرمانبرداری نہیں ہوسکتی۔

1749 - ﴿تَجْـَٔرُوْنَ﴾۔ جَارَ کے معنی ہیں دعا میں مبالغہ اور تضرع کیا۔ یعنی بہت فریاد اور زاری کی اور جُؤَارٌ اصل میں وحشی کے چیخنے کو کہا جاتا ہے۔ (غ)

یہ تیسری شہادت فطرت انسانی کی ہے کہ دکھ کے وقت وہ صرف ایک خدا کی طرف رجوع کرتا ہے۔

عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ ﴿۵۶﴾

جوتم افترا کرتے تھے۔ (1750)

وَ يَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهٗ ۙ وَ لَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿۵۷﴾

اور اللہ کے لیے بیٹیاں ٹھہراتے ہیں وہ پاک ہے اور ان کے لیے ہے جو وہ چاہتے ہیں۔

وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّ هُوَ كَظِيْمٌ ۚ ﴿۵۸﴾

اور جب ان میں سے ایک لڑکی کو خبر دی جاتی ہے اس کا منہ سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ غصہ سے بھرا ہوتا ہے۔ (1751)

يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۵۹﴾

وہ اس خبر کی برائی سے جو اسے دی جاتی ہے لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے کیا اسے ذلت کے ساتھ رہنے دے یا اسے مٹی میں گاڑ دے۔ سنو بہت برا ہے جو وہ فیصلہ کرتے ہیں۔ (1752)

1750 - ﴿لِمَا لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ میں ضمیر اٰلِهَةٌ کی طرف ہے جن کے بنانے کا ذکر ﴿يَجْعَلُوْنَ﴾ میں ہے اور اس کا مفعول محذوف ہے یعنی کچھ علم نہیں رکھتے اور خود کفار کی طرف بھی ہو سکتی ہے۔ یعنی وہ کفار ان معبودوں کی اصل حقیقت سے کچھ بھی واقف نہیں۔

﴿تَاللّٰهِ﴾۔ ت عموماً افعال کی ابتدا یا آخر میں آتی ہے جیسے [تَضْرِبُ، ضُرِبَتْ] لیکن اسماء کی ابتدا اور آخر میں بھی آتی ہے اور ابتدا میں اسم اللہ کے ساتھ مخصوص ہے اور تعجب کے لیے آتی ہے اور اس کے معنی قسم ہوتے ہیں اور ب اور و سے جو قسم آتی ہے اس سے بڑھ کر اس میں تعجب کے معنی ہوتے ہیں۔ (مغنی)

1751 - ظَلَّ۔ ظَلَّ کے معنی بیان ہو چکے ہیں۔ ظَلَّ (ظَلْتُ ایک لام کے حذف سے اور ظَلَلْتُ) اس کام پر بولا جاتا ہے جو دن کے وقت کیا جائے اور پھر اس کے معنی صَارَ کی طرح ہو گئے ہیں۔ (غ)

﴿وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا﴾ چہرہ کی سیاہی سے مراد غم، فکر، نفرت وغیرہ کا پیدا ہونا ہے۔ (ر) سچ مچ سیاہ ہونا مراد نہیں۔

توجہ دلائی ہے کہ کس قدر انسان اپنے فعل سے خود الزام کے نیچے ہے اپنے خدا کی طرف بیٹیاں منسوب کرنے والے لوگ اپنے ہاں بیٹی کی خبر کو کس قدر برا مناتے ہیں۔ گویا خوف فطرت انہیں ملزم کر رہی ہے۔

1752 - ﴿يَتَوَارٰى﴾۔ وَرٰی سے ہے [دیکھو نمبر: 816]۔ اور اس کے معنی ہیں اپنے آپ کو چھپاتا ہے۔

يَدُسُّ۔ دَسّ ایک چیز کا دوسری میں جبر کے ساتھ داخل کرنا ہے۔ (غ) اور [دَسَسْتُ الشَّيْءَ فِي التُّرَابِ] کے معنی ہیں

لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ ۚ وَ لِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى ؕ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ ع 7 10 13

جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے ان کی بری مثال ہے اور اللہ کی صفت نہایت بلند ہے اور وہ غالب حکمت والا ہے۔ (1753)

ایک چیز کو مٹی میں چھپا دیا اور یہاں مراد زندہ دفن کرنا ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ﴿وَ اِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ۝﴾ [التکویر: 8:81] ''اور جب زندہ درگور کی ہوئی سے پوچھا جائے گا۔'' اور یَدُسُّهٗ میں ضمیر مذکر ہے (ایسا ہی یُمْسِكُهٗ میں) اس لیے کہ بلحاظ لفظ ضمیر ﴿مَا بُشِّرَ بِهٖ﴾ کی طرف جاتی ہے اور ﴿وَ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝﴾ [الشمس: 10:91] ''اور وہ نامراد رہا جس نے اسے دفن کیا۔'' میں یہی مادہ ہے۔ (ل) اس لیے کہ وہاں بھی بمقابلہ تزکیہ کے جس میں نشوونما کا خیال پایا جاتا ہے۔ قوائے یا نعمائے خداداد کا اخفا مراد ہے۔

اللہ تعالیٰ کی توحید کے ذکر میں ہی یہ **ایک عظیم الشان اصلاح بھی قرآن کریم نے کی ہے یعنی لڑکیوں کو مار دینا جس کا رواج ملک عرب میں بالخصوص اعلیٰ طبقہ میں بہت پایا جاتا تھا۔** بعض باتیں اصلاح کی ایسی ہیں کہ پہلے دن سے ہی قرآن کریم نے ان کی طرف توجہ دلائی ہے۔ حالانکہ کوئی تفصیلات شریعت ابھی نازل نہ ہوئی تھیں جیسے یتامیٰ اور مساکین کی خبر گیری۔ انہی میں لڑکیوں کو مارنے یا زندہ گاڑنے کا رواج ہے جس کی اصلاح قرآن کریم نے ابتدا سے مدنظر رکھی۔ چنانچہ اس سے بہت پہلے کی وحی میں ہے ﴿وَ اِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ۝﴾ [التکویر: 8:81] ''اور جب زندہ درگور کی ہوئی سے پوچھا جائے گا۔'' عرب میں لڑکی کو جب وہ پانچ چھ سال کی عمر کو پہنچ جاتی تو یا گڑھا کھود کر اس میں زندہ دھکیل کر اوپر سے مٹی ڈال دیتے یا پہاڑ سے نیچے گرا دیتے۔ اس سنگدلی پر رحمۃ للعالمین کا دل پگھلا اور آپ کی آواز نے وہ اثر پیدا کیا جو نہ کوئی قانون اور نہ کوئی عبرتناک سزا پیدا کر سکتی ہے۔ اسلام کے بعد اس بے رحمی کے اعادہ کی ایک اکیلی نظیر بھی پیش نہیں کی جا سکتی۔ **بدی کو دور کرنے کی جو طاقت آپ کو دی گئی ہے اس کی نظیر کوئی اور طاقت دنیا میں نظر نہیں آتی۔**

1753- ﴿لِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى﴾ چونکہ دوسری جگہ قرآن شریف میں ہے ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ [الشوریٰ: 11:42] ''اس کی مثل کوئی چیز نہیں۔'' اس لیے یہاں مَثَل کے معنی وصف مراد ہیں۔ اور راغب نے اس آیت میں دونوں جگہ مثل کے معنی وصف ہی کیے ہیں [لَهُمُ الصِّفَاتِ الذَّمِيْمَةِ وَلَهُ الصِّفَاتُ الْعُلٰى] یعنی آخرت پر ایمان نہ لانے والوں کی صفات نہایت بری ہیں اور اللہ تعالیٰ کی صفات بلند ہیں۔ اور پہلے حصہ میں معنی مثال بھی ہو سکتے ہیں اور اصل غرض تو یہ توجہ دلانا ہے کہ ان لوگوں کی حالت کیسی بری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف وہ بات منسوب کرتے ہیں جو اپنے لیے بھی پسند نہیں کرتے۔ لیکن ساتھ ہی سمجھا دیا کہ اگر یہ اپنے لیے بیٹوں کو پسند کرتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے لیے بھی بیٹا تجویز کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اوصاف بہت بلند ہیں اور اس کی ذات ان تمام باتوں سے پاک ہے۔ جو گو انسانوں کے لیے محبوب ہوں مگر وہ ایک رنگ کا نقص ہے جو مخلوق میں پایا جاتا ہے اور خالق کی ذات اس سے برتر ہے۔

وَ لَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّ لٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۶۱﴾

اور اگر اللہ لوگوں کو ان کے ظلم پر پکڑتا تو اس پر کوئی جاندار نہ چھوڑتا لیکن وہ انہیں ایک وقت مقرر تک مہلت دیتا ہے پس جب ان کا وقت آ جائے گا وہ ایک گھڑی بھی پیچھے نہیں رہ سکتے اور نہ آگے جا سکتے ہیں۔ (1754)

وَ يَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ مَا يَكْرَهُوْنَ وَ تَصِفُ اَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ اَنَّ لَهُمُ الْحُسْنٰى ؕ لَا جَرَمَ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ وَ اَنَّهُمْ مُّفْرَطُوْنَ ﴿۶۲﴾

اور اللہ کے لیے وہ ٹھہراتے ہیں جسے خود ناپسند کرتے ہیں اور ان کی زبانیں جھوٹ بیان کرتی ہیں کہ ان کے لیے بھلائی ہے۔ حق یہی کہ ان کے لیے آگ ہے اور یہ کہ وہ آگے بھیجے جائیں گے۔ (1755)

1754 - دَآبَّةٍ سے مراد بعض کے نزدیک سب جاندار ہیں اور بعض کے نزدیک صرف وہی ظالم لوگ ہیں جو ظلم کرتے ہیں اور سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ دَآبَّةٍ سے مراد یہاں مشرک ہیں۔ (ر) اور گو یہ سچ ہے کہ اگر کل انسان تباہ ہو جائیں تو دوسرے جانداروں کی جو انسان کی خاطر ہی پیدا کیے گئے ہیں کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ لیکن ظلم کا ذکر صاف بتاتا ہے کہ مراد وہی مخلوق ہے جو ظلم کر سکتی ہے یعنی انسان۔ اور اس آیت میں **آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں جو حالت دنیا کی تھی اس کی تصویر کھینچی** ہے۔ یعنی ظلم اس حد تک دنیا میں پھیل گیا ہے کہ زمین اس قابل نہ رہی تھی کہ اس پر انسان باقی رہے۔ کیونکہ انسان نے اپنے خدا کو بالکل بھلا دیا اور ساری دنیا خطرناک شرک اور معصیت میں گرفتار ہو گئی۔ گویا روحانی طور پر دنیا پر موت وارد ہو گئی۔ اس لیے یہ اس قابل تھی کہ اسے ویسے بھی مٹا دیا جاتا، مگر اس موت سے اس آسمانی بارش نے اسے بچایا جس کا ذکر صاف الفاظ میں رکوع کے آخر میں ہے۔

1755 - ﴿مُّفْرَطُوْنَ﴾۔ فَرَطَ کے معنی [نمبر: 931] میں بیان ہو چکے ہیں اور اِفْرَاطٌ کے معنی آگے بڑھنے میں حد سے تجاوز کرنا ہیں اور اِفْرَاطٌ کے معنی اِعْجَالٌ یعنی جلدی کرنا بھی ہیں اور اس کے معنی ترک کرنا اور بھلا دینا بھی آتے ہیں: [وَمَا أَفْرَطْتُ مِنَ الْقَوْمِ أَحَدًا أَيْ مَا تَرَكْتُ وَأَفْرَطَ الشَّيْءَ نَسِيَهُ] (ل) پس مُّفْرَطٌ کے معنی آگے بھیجا ہوا، جلدی بھیجا ہوا یا عذاب میں چھوڑا ہوا ہو سکتے ہیں۔ فَرَّاء نے یہی آخری معنی لیے ہیں۔ (ل)

ان کے اعتقادات فاسد کی تصویر یہاں کھینچی ہے کہ خدا کی طرف وہ باتیں منسوب کرتے ہیں جو اپنے لیے بھی پسند نہیں کرتے۔ اسی کا اثر اعمال پر بھی ہوتا ہے یہاں تک کہ نیک اور بزرگ لوگوں کی طرف بدیاں منسوب کرنے لگتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بدی آہستہ آہستہ دل کو اچھی معلوم ہونے لگتی ہے۔ یہ بدترین حالت ہے جس پر قوم پہنچ جاتی ہے۔

تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰۤى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۳﴾

اللہ کی قسم ہم نے تجھ سے پہلے قوموں کی طرف رسول بھیجے پھر شیطان نے انہیں ان کے (برے عمل) اچھے کر کے دکھائے سو وہ آج ان کا دوست ہے اور ان کے لیے دردناک دکھ ہے۔ (1756)

وَ مَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۶۴﴾

اور ہم نے تجھ پر کتاب صرف اس لیے نازل کی ہے کہ تو ان کے لیے وہ باتیں کھول کر بیان کرے جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں اور وہ ان لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے جو ایمان لاتے ہیں۔ (1757)

وَ اللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ﴿۶۵﴾ ع 8 5 14

اور اللہ ہی بادل سے پانی اتارتا ہے پھر اس کے ساتھ زمین کو اس کی موت کے بعد زندہ کرتا ہے۔ یقیناً اس میں لوگوں کے لیے نشان ہے جو سنتے ہیں۔

وَ اِنَّ لَكُمْ فِى الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ؕ

اور تمہارے لیے چارپایوں میں عبرت ہے

1756 - یہاں بتایا کہ پہلے بھی ہم رسول بھیجتے رہے جس طرح اب رسول بھیجا ہے۔ لیکن ان کے متبعین بھی گمراہ ہو گئے اور شیطان نے برے عملوں کو ان کے لیے ایسا خوبصورت کر دکھایا کہ وہ اس کے پیچھے لگ گئے۔ یہاں تک کہ آج یعنی رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت وہ اس طرح شیطان کے تصرف میں آ گئے کہ وہی ان کا ولی اور رفیق ہے۔

1757 - جب پہلے رسولوں کا ذکر کیا تو اب ساتھ ہی بتایا کہ باوجود پہلی قوموں میں رسولوں کے آنے کے اب ایک اور رسول کی ضرورت تھی تا کہ ان میں جو اختلافات پیدا ہو گئے ہیں وہ اپنی وحی یعنی قرآن سے ان کا فیصلہ کر دے۔ تمام دنیا کے اختلافات مذہبی کا فیصلہ سوائے اللہ تعالیٰ کی وحی کے نہ ہو سکتا تھا اور چونکہ قرآن سب اختلافات کا فیصلہ کرتا ہے اس لیے خود مسلمانوں میں کوئی اس قسم کا اختلاف نہیں ہو سکتا جیسے پہلے مذاہب میں اختلافات ہوئے یعنی اصولی اختلاف نہیں۔ اگلی آیت میں آسمانی پانی وحی الٰہی ہے جو مردہ دلوں کو زندہ کرتی ہے۔

نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ﴿٦٦﴾

ہم تمہیں اس چیز سے جو ان کے پیٹوں میں ہے گوبر اور خون کے درمیان سے خالص دودھ پلاتے ہیں جو پینے والوں کے لیے خوشگوار ہے۔ (1758)

وَ مِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَ الْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّ رِزْقًا حَسَنًا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿٦٧﴾

اور کھجوروں اور انگوروں کے میووں میں سے تم اس سے شراب اور اچھا رزق بناتے ہو۔ یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے نشان ہے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔ (1759)

1758 - **چارپایوں میں انسان کے لیے عبرت:** پچھلے رکوع میں وحی الٰہی کا ذکر تھا کہ رفع ظلم واختلاف کے لیے اس کی ضرورت ہے۔ اس پر یہ اعتراض ہوتا تھا کہ انسان اپنی عقل سے ہی سب کچھ کرسکتا ہے۔ تو سمجھایا کہ دیکھو اگر تمہیں دودھ کی ضرورت ہے تو تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ چارہ اور گھاس کو لے کر اس کا جوہر دودھ کی صورت میں نکال لو۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے جو اپنی قدرت سے حیوانوں کے اندر ایک کل پیدا کی ہے وہ اس چارہ کو بدل کر تین چیزوں کی صورت میں بن جاتی ہے۔ ایک فضلہ جو گوبر کی صورت میں نکل جاتا ہے، دوسرا خون جو حیوان کے بقا کا موجب ہے اور ان دونوں کے درمیان ایک تیسری چیز دودھ بن جاتی ہے جو انسان کے پینے کے لیے ایک نہایت ہی خوشگوار چیز ہے۔ پس اگر ایک اپنی زندگی کی ضرورت دودھ کے لیے انسان قدرت کی کل کا محتاج ہے اور خود اسے نہیں بنا سکتا تو روحانی بقا کے لیے بھی اس کی اپنی کوشش کارگر نہیں ہوسکتی۔

1759 - سَکَرٌ۔ سُکَرٌ کے لیے [دیکھو نمبر: 663] اور سَکَرٌ اس چیز کو کہا جاتا ہے جس سے سُکَرٌ یعنی نشہ پیدا ہو۔ (غ) اور مراد اس سے خمر ہے۔ (ج)

دوسری مخلوق میں عبرت:

اس آیت میں پچھلی آیت کے مضمون کو وسیع کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسانی زندگی کے بقا کے لیے ہر قسم کے پھل اللہ تعالیٰ نے ہی انسان کے لیے پیدا کر رکھے ہیں۔ پس ضرور تھا کہ بقائے روحانی کے سامان بھی وہ خود پیدا کرتا اور انہیں انسان پر نہ چھوڑتا۔ کیونکہ کسی چیز کا پیدا کرنا اس کی طاقت سے باہر ہے۔ ہاں پیدا شدہ چیز کو وہ استعمال کرسکتا ہے۔ اور یہاں اس کے استعمال میں برے اور اچھے استعمال کی طرف توجہ دلائی ہے کہ خدا کے پیدا کیے ہوئے پھلوں سے انسان شراب بھی بنالیتا ہے جو ان کا برا استعمال ہے کیونکہ اس سے نقصان پیدا ہوتا ہے اور رزق حسن بھی لے لیتا ہے۔ رزق حسن کے مقابل پر سکر کو لانے سے صاف اس کی برائی کی طرف اشارہ کیا ہے اور حالانکہ ابھی تک شراب کی حرمت کا حکم نہیں آیا تھا کیونکہ یہ سورت مکی ہے مگر یہاں جس رنگ میں سکر کا ذکر کیا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی ساری تعلیم ایک ہی اصول پر ہے۔

وَ اَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَ مِمَّا یَعْرِشُوْنَ ﴿۶۸﴾

اور تیرے رب نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی کہ پہاڑوں میں گھر بنا اور درختوں میں اور اس میں جو وہ بناتے ہیں۔

ثُمَّ كُلِیْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِیْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ؕ یَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِیْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۶۹﴾

پھر تمام پھلوں سے کھا اور اپنے رب کے رستوں پر فرمانبرداری سے چلی جا، ان کے پیٹوں سے پینے کی چیز نکلتی ہے جس کے رنگ مختلف ہیں اس میں لوگوں کے لیے شفا ہے۔ یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے نشان ہے جو فکر کرتے ہیں۔ (1760)

وَ اللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ یَتَوَفّٰىكُمْ ۟ وَ مِنْكُمْ مَّنْ یُّرَدُّ اِلٰۤى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَیْ لَا یَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَیْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ قَدِیْرٌ ﴿۷۰﴾ ع 9 5 15

اور اللہ نے تمہیں پیدا کیا پھر وہ تمہیں مارتا ہے اور تم میں سے کوئی وہ ہے جو نہایت خراب عمر کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے تاکہ جاننے کے بعد کچھ نہ جانے۔ اللہ جاننے والا قدرت والا ہے۔ (1761)

1760 - **شہد کی مکھی سے سبق:** یہ تیسری مثال اسی اصول کی وضاحت کے لیے ہے اور یہاں وحی کا ذکر صفائی سے کیا ہے۔ گو یہ وحی اور رنگ کی ہے۔ شہد کی مکھی علم حاصل نہیں کرتی بلکہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ اس کی فطرت میں رکھ دیا ہے اس کے مطابق چل کر مختلف پھولوں سے شیرینی حاصل کر کے اسے ایسے رنگ میں جمع کرتی ہے جو انسانوں کے لیے موجب شفا ہے۔ انسان اپنے سارے علوم کو خرچ کر کے وہ چیز پیدا نہیں کر سکتا۔ اسی طرح جب انسان کی ہدایت کے لیے اس کی شفائے روحانی کے لیے ایک شہد کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ مقصد بھی انسان کے علوم مکتب سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس کے لیے ایک وحی کی ضرورت ہے۔ ہاں چونکہ اللہ تعالیٰ کا تعلق جو اپنی ایسی مخلوق سے ہے جیسے شہد کی مکھی اس سے بہت بڑھ کر اسے انسان سے ہے اور یہ غرض بھی اعلیٰ اور ارفع ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی یہ وحی بھی اعلیٰ اور ارفع ہے۔ اور یہ وحی الٰہی کا ہی کام تھا کہ تمام مذاہب کے اختلافات کا فیصلہ کرتی۔ کوئی انسان اپنی کوشش سے یہ نہ کر سکتا تھا۔ اس پر زیادہ تفصیل کے لیے دیکھو نوٹ جو تمہید سورت میں اس سورت کے نام پر دیا گیا ہے۔

1761 - انسان کے حالات میں اللہ تعالیٰ کی قدرت نمائی ہے کس طرح پیدا ہوتا ہے، پھر بڑھتا ہے، پھر گھٹتا ہے یہاں تک کہ وفات

وَ اللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ ؕ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝

اور اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر روزی میں فضیلت دی ہے۔ تو جنہیں فضیلت دی گئی ہے وہ اپنی روزی انہیں نہیں دیتے جو ان کے ماتحت ہیں کہ وہ اس میں برابر ہو جائیں۔ تو کیا اللہ کی نعمت کا انکار کرتے ہیں۔ (1762)

پاتا ہے اور ارذل عمر وہ ہے جس میں عجز اور ذلت کی حالت انسان پر وارد ہو جاتی ہے۔ علم کے بعد نہ جاننے سے یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ جو کچھ علم سیکھا تھا وہ بھول جاتا ہے اور یہ بھی کہ جتنا علم حاصل کیا پھر اس کے بعد اور علم حاصل نہیں کر سکتا اور انسان کے حالات میں قوموں کے لیے سبق ہے کہ ان پر بھی ایک ارذل حالت آتی ہے اور اس کی طرف بھی یہاں اشارہ ہے۔ اور یہ بھی اشارہ ہے کہ انسان کے علم کی ایک انتہا ہے اللہ تعالیٰ کے علم کی کوئی انتہا نہیں۔

1762 - **انسانوں کے مراتب میں اختلاف اور نزول وحی:** ﴿مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ﴾ سیاق سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مراد اس سے وہ لوگ ہیں جو دوسروں کے ماتحت ہیں یا جن سے دوسرے کام لے کر بہت دولت کے مالک بن جاتے ہیں۔ شاید اسی مناسبت سے رَآدِّيْ (رَآدِّيْنَ یعنی لوٹانے والے) کا لفظ استعمال فرمایا۔ اس رکوع میں چند ایک تمثیلات بیان فرمائی ہیں جن میں یہ توجہ دلائی ہے کہ مہبط وحی ﷺ کو دوسرے عام انسانوں پر اللہ تعالیٰ نے ہی فضیلت دی ہے۔ اس سب سے پہلی مثال میں یہ سمجھایا ہے کہ ظاہری سامان معیشت میں بھی جو سب کے لیے یکساں کھلے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ہی بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ ایک کام کے لینے والے ہیں ایک کام دینے والے۔ اسی طرح پر روحانیت میں الگ الگ استعدادیں ہیں جس کی طرف آیت کے آخر میں ﴿نِعْمَةَ اللّٰهِ﴾ کا لفظ لا کر توجہ دلائی ہے۔ خصوصیت سے ﴿نِعْمَةَ اللّٰهِ﴾ کا اطلاق وحی الٰہی پر ہی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ وہ فی الحقیقت سب سے بڑی نعمت الٰہی انسانوں پر ہے۔ اور بعض مفسرین نے بھی اس سے یہی مراد لی ہے اور ﴿فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا﴾ جملہ معترضہ کے طور پر ہے۔ جس کے معنی بعض نے یوں بھی لیے ہیں کہ اپنے مملوکوں کو تمہیں اپنے برابر رکھنا چاہیے۔ جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ انہیں وہ کھانا دو جو خود کھاتے ہو اور وہ لباس پہناؤ جو خود پہنتے ہو۔ اور یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ نظام عالم اس طرح کی مساوات پر نہیں چل سکتا کہ سب میں مال و دولت برابر تقسیم ہو۔ اس لیے فرق مراتب رکھا ہے۔ اور استعداد روحانیت میں اس فرق کا ذکر یہاں اس لیے کیا کہ پچھلے رکوع میں شہد کی مکھی کی طرف وحی کا ذکر کر کے سمجھایا تھا کہ وحی الٰہی جو سامان انسان کے لیے مہیا کر سکتی ہے وہ انسان اپنی کوشش سے نہیں کر سکتا۔ تو اس پر یہ اعتراض ہوتا تھا کہ پھر ہر شخص کو خود وحی کیوں نہیں ہو جاتی۔ اور کفار کا یہ اعتراض قرآن شریف میں بھی منقول بھی ہے ﴿حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ﴾ [الأنعام: 124:6] ''یہاں تک کہ ہم کو اس کی مثل دیا جائے جو اللہ کے رسولوں کو دیا گیا۔'' مفسرین نے اس مثال کو شرک پر لگایا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کو بتوں کی طرف منسوب کرتے ہو۔

وَ اللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَ حَفَدَةً وَّ رَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ؕ اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ ﴿۷۲﴾

اور اللہ نے تمہارے لیے تم سے ہی عورتیں بنائیں اور تمہارے لیے تمہاری عورتوں سے بیٹے اور پوتے بنائے اور تمہیں ستھری چیزوں سے رزق دیا تو کیا جھوٹ کو مانتے ہیں اور اللہ کی نعمت کا وہ انکار کرتے ہیں۔ (1763)

وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ شَيْـًٔا وَّ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۷۳﴾

اور اللہ کے سوائے ان کی عبادت کرتے ہیں جو انہیں آسمانوں اور زمین سے رزق دینے کا کوئی اختیار نہیں رکھتے اور نہ ہی کچھ طاقت رکھتے ہیں۔

فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۷۴﴾

پس اللہ کے لیے مثالیں نہ بیان کرو۔ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ (1764)

1763 - ﴿اَنْفُسِكُمْ﴾ سے مراد [مِنْ جِنْسِكُمْ وَ نَوْعِكُمْ] ہے (ر) یعنی تمہاری جنس اور نوع سے یہاں سے ﴿وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا﴾ کے معنی پر روشنی پڑتی ہے۔

﴿حَفَدَةً﴾ حَافِدٌ کی جمع ہے اور حَفَدٌ کے معنی خدمت اور کام میں سرعت ہیں۔ چنانچہ دعائے قنوت میں آتا ہے [وَاِلَيْكَ نَسْعٰى وَنَحْفِدُ] یعنی عمل اور خدمت میں جلدی کرتے ہیں جس سے مراد فرمانبرداری ہے اور حَفَدَةٌ کے معنی مددگار اور خدمت گزار ہیں اور بیٹیوں کو بھی حَفَدَةٌ کہتے ہیں اور بعض کے نزدیک اولاد کی اولاد ہے یعنی پوتے اور بعض کے نزدیک اصہار یعنی بی بی کے قرابتی یا داماد۔ (ل) اور ابن جریر نے مختلف اقوال نقل کر کے کہا ہے کہ اصل میں اس کی یہی ہے کہ مراد اس سے خدمت کرنے والے ہیں اور یہ سب لوگ اس کے اندر شامل ہیں اور خود ازواج اور بیٹے بھی ایک رنگ میں حَفَدَةٌ ہیں۔

اس آیت میں بھی اختلاف مراتب کی طرف ہی توجہ دلائی ہے۔ حالانکہ سب انسان ایک ہی ہیں مگر ان میں کوئی مرد ہے، کوئی عورت، کوئی باپ ہے، کوئی بیٹا، کوئی خسر ہے، کوئی داماد۔ گویا اختلاف مراتب پر نظام عالم کا دارومدار ہے اور آخر پر نعمت اللہ یعنی وحی الٰہی کے انکار کے مقابل پر ان کے باطل پر ایمان یعنی بت پرستی کا ذکر کیا اور اس لیے اگلی آیت میں کھول کر ان کی بت پرستی کا ذکر کیا۔

1764 - اَمْثَالَ۔ مِثْلَ کی جمع بھی ہوسکتی ہے اور اس صورت میں امثال سے مراد ہوگی کہ اس کے شریک مت بناؤ اور تَضْرِبُوْا کے معنی

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّ جَهْرًا ؕ هَلْ يَسْتَوٗنَ ؕ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾

اللہ ایک غلام کی مثال بیان کرتا ہے جو (دوسرے کے) اختیار میں ہے کسی چیز کی طاقت نہیں رکھتا اور ایک وہ ہے جسے ہم نے اپنے ہاں سے اچھا رزق دیا ہے، سو وہ اس سے چھپا کر اور ظاہر خرچ کرتا ہے کیا یہ دونوں برابر ہیں؟ سب تعریف اللہ کے لیے ہے بلکہ ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔ (1765)

وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَاۤ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّ هُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰىهُ ۙ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ ؕ هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ ۙ وَ مَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ وَ هُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۷۶﴾ ع 10 6 16

اور اللہ دو آدمیوں کی مثال بیان کرتا ہے ایک ان میں سے گونگا ہے، کوئی کام نہیں کر سکتا اور وہ اپنے مالک پر بوجھ ہے، جدھر اسے بھیجتا ہے کوئی اچھا کام کر کے نہیں آتا۔ کیا وہ اور ایسا شخص برابر ہیں جو انصاف کا حکم دیتا ہے اور وہ سیدھے رستہ پر ہے۔ (1766)

تَجْعَلُوْا ہوں گے ﴿فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا﴾ [البقرة: 22:2] ''پس تم اللہ کے ہمسر نہ ٹھہراؤ'' اور یہ معنی سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہیں اور عموماً اسے مَثَل کی جمع مانا گیا ہے۔ اور اس صورت میں مراد یہ ہوگی کہ کسی دوسرے کو اس جیسا نہ کہا جائے نہ اسے دوسرے جیسا۔ یا یہ کہ اس کی صفات میں کسی کو شریک نہ کیا جائے۔

1765 - یہ **کافر اور مومن کی مثال** ہے۔ (ج) اور غرض وہی ہے جس کا ذکر پہلے ہوا۔ جب کافر اور مومن میں بھی یہ فرق بین ہے تو اول المومنین کے ساتھ ان کفار کو کیا نسبت ہو سکتی ہے اور یا رزق حسن سے مراد وحی الٰہی ہے اور وہ جسے رزق حسن دیا ہے وہ مہبط وحی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ اگلی آیت کے آخری الفاظ اسی کے مؤید ہیں اور سِرًّا خرچ کرنا اپنے قویٰ کو مخلوق کی خدمت میں لگانا ہے اور جَهْرًا اپنے مال کو۔ اور کافر یا مشرک یا عبد مملوک ہے۔ اس لیے کہ جن چیزوں پر اسے حکومت کرنے کے لیے بنایا گیا تھا وہ اپنے آپ کو ان کا محکوم اور انہیں اپنا معبود اور مسجود بناتا ہے اور ﴿لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ﴾ اس لیے کہ جس غرض کے لیے اس کے اندر اعلیٰ درجہ کے قویٰ رکھے گئے تھے وہ اسے پورا نہیں کرتا۔ اس لیے اسے نتیجہ بھی کچھ نہیں ملتا ﴿لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ﴾ [إبراهيم: 18:14] ''جو کچھ انہوں نے کمایا تھا اس میں سے کوئی چیز ان کے ہاتھ نہ آئے گی۔''

1766 - كَلٌّ۔ کُلّ وہ ہے جو سارے اجزا کو جمع کر لے اور [كَلَّ يَكِلُّ كَلًّا] کے معنی ہیں تھک گیا اور یہاں مراد وہ ہے جو دوسرے پر بوجھ ہو یا دوسرے کے لیے بمنزلہ عیال کے ہو کہ اس کا بوجھ اسے اٹھانا پڑے۔ (ل)

وَ لِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ مَاۤ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۷۷﴾

اور آسمانوں اور زمین کا (علم) غیب اللہ کو ہی ہے اور قیامت کا معاملہ آنکھ کے جھپکنے کی طرح ہے بلکہ اس سے بھی قریب۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (1767)

یہ مثال بھی ویسی ہی ہے جیسی اس سے پہلی۔ مگر یہاں ﴿مَنْ یَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ وَ هُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۷۶﴾﴾ سے زیادہ وضاحت کردی ہے۔ بعض نے ان الفاظ کی وجہ سے یہ خیال کیا ہے کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ ہے اور اَبْكَمُ سے مراد بت ہیں اور پھر پہلی مثال کو بھی اسی پر قیاس کیا ہے۔ مگر اللہ کی مثال کسی چیز سے نہیں دی جاسکتی جیسا کہ ابھی خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ﴾ اس لیے ﴿مَنْ یَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ﴾ سے مراد رسول اللہ ﷺ ہی ہیں اور آپ ہی صراط مستقیم پر ہیں اور اس کی مثال میں اسی مضمون کی طرف توجہ دلائی ہے جس کا ذکر اس رکوع میں ہے ﴿اَیْنَمَا یُوَجِّهْهُ لَا یَاْتِ بِخَیْرٍ﴾ میں یہ بھی بتادیا ہے کہ کافر اپنے کسی مقصد میں کامیاب نہ ہوں گے۔

1767 - لَمْحٍ۔ لَمَحَ اور اَلْمَحَ کے معنی ہیں آنکھ جھپکا کر دیکھا اور لَمْحَةٌ عجلت کے دیکھنے کو کہتے ہیں اور [لَمَحَ الْبَرْقُ] بجلی کی چمکار پر بھی بولا جاتا ہے۔ (ل) کیونکہ وہ بھی عجلت سے ہوتی ہے اور ﴿كَلَمْحِ الْبَصَرِ﴾ سے مراد اس کا عجلت سے آجانا ہے اور ﴿اَوْ هُوَ اَقْرَبُ﴾ میں اَوْ بمعنی بَلْ ہے یعنی آنکھ جھپکنا۔ گو ایک بہت قلیل وقفہ کو چاہتا ہے مگر وہ ساعت جب آئے گی تو اس سے بھی جلدی آجائے گی۔ یہ ایک بات تھی جو ان کے وہم میں بھی نہ آسکتی تھی۔ اس لیے فرمایا کہ اس سے بھی جلدی آجائے گی جو تمہارے وہم میں آسکے۔

عذاب دنیا اور الساعۃ:

قرآن کریم کا تسلسل مضمون اس سے ظاہر ہے کہ کس طرح یہاں پھر اس ساعت کا ذکر کیا ہے جو اس سورت کا اصل منشا ہے جس کی طرف سب سے پہلی آیت میں ان الفاظ میں توجہ دلائی تھی ﴿اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ﴾ پھر چوتھے رکوع کے شروع میں [آیت نمبر: 26] میں ان کے مکروں کا ذکر کرکے فرمایا تھا ﴿اَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَیْثُ لَا یَشْعُرُوْنَ ﴿۲۶﴾﴾ پھر اسی رکوع کے آخر میں [آیت نمبر: 33] میں فرمایا ﴿هَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ تَاْتِیَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ یَاْتِیَ اَمْرُ رَبِّكَ﴾ پھر چھٹے رکوع میں [آیت نمبر: 45 تا 47] میں مختلف قسم کے عذابوں کا ذکر کیا جو ان پر آنے والے تھے۔ اور اب پھر اس ساعت کا ذکر کرتا ہے جو ساعت کبریٰ یعنی قیامت کے لیے بطور ایک نمونہ کے ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس رکوع کی آخری آیات میں صاف طور پر کافروں کے پھر جانے اور رسول اللہ ﷺ کے انکار کا ذکر ہے۔

وَ اللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۸﴾

اور اللہ نے تمہیں تمہارے ماؤں کے پیٹوں سے پیدا کیا تم کچھ بھی نہ جانتے تھے اور تمہیں کان اور آنکھیں اور دل دیئے تا کہ تم شکر کرو۔ (1768)

اَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِيْ جَوِّ السَّمَآءِ ؕ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۷۹﴾

کیا یہ پرندوں کو نہیں دیکھتے جو آسمان کی فضا میں رام کیے ہوئے ہیں اللہ کے سوائے انہیں کوئی نہیں تھامتا۔ اس میں ان لوگوں کے لیے نشان ہیں جو ایمان لاتے ہیں۔ (1769)

1768 - اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انسان پر اپنے عظیم الشان احسان کا ذکر کیا ہے کہ اس نے اس کے اندر سننے اور دیکھنے اور سوچنے کی وہ طاقتیں رکھ دی ہیں جن سے وہ بڑے بڑے کام لیتا ہے۔ چنانچہ [آیت نمبر: 80, 81] میں جن نعمتوں کے دینے کا ذکر ہے کہ تمہارے لیے گھر بنائے اور تمہارے لیے لباس بنائے وہ انسان سب اپنے علم سے اور اپنی جدوجہد سے ہی حاصل کر لیتا ہے۔ مگر اسی لیے اسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا کہ اگر وہ طاقتیں اس نے انسان کے اندر نہ رکھی ہوتیں تو انسان یہ کام نہ کر سکتا تھا اور ﴿لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا﴾ سے اس لیے ابتدا کی کہ وحی الٰہی بھی انسان کو ایک علم دیتی ہے۔ تو جب علم ظاہری کے لیے بعض قوائے خداداد کی ضرورت ہے تو علم باطنی کے لیے بھی ایسی ہی ضرورت ہے۔

1769 - جَوّ کے معنی ہوا ہیں۔ (غ) یا آسمان اور زمین کے درمیان جو کچھ ہے۔

پرندوں کا تعلق ذکر عذاب سے:

پرندوں کے ہوا میں روکنے کا ذکر دو جگہ قرآن شریف میں ہے۔ ایک یہاں اور ایک سورۂ ملک میں ﴿اَوَ لَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صٰٓفّٰتٍ وَّ يَقْبِضْنَ ۛؕ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ﴾ [الملك: 19:67] ''کیا وہ اپنے اوپر پرندوں کو نہیں دیکھتے (جو) پر پھیلائے ہوئے (ہیں) اور سکیڑ (بھی) لیتے ہیں۔ سوائے رحمٰن کے انہیں کون روک رکھتا ہے۔'' یہاں بھی اعدا پر عذاب آنے کا ذکر ہے اور وہاں اس سے بھی زیادہ صاف الفاظ میں ہے۔ کیونکہ پہلی آیت میں ہے ﴿وَ لَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿۱۸﴾﴾ [الملك: 18:67] ''اور انہوں نے بھی جھٹلایا جو اُن سے پہلے تھے۔ سو میری ناپسندیدگی کا (انجام) کیسا ہوا۔'' اور بعد کی آیت میں ہے ﴿اَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ﴾ [الملك: 20:67] ''بھلا وہ کون ہے جو تمہارے لیے لشکر ہو کر رحمٰن کے مقابلہ میں تمہیں مدد دے؟'' اور کوئی تعلق اس آیت کا یہاں نہیں

وَ اللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَ يَوْمَ اِقَامَتِكُمْ ۙ وَ مِنْ اَصْوَافِهَا وَ اَوْبَارِهَا وَ

اور اللہ نے تمہارے لیے تمہارے گھروں کو رہنے کی جگہ بنایا اور تمہارے لیے چارپایوں کی کھالوں سے گھر بنائے جنہیں تم اپنے کوچ کے وقت اور گھر میں ٹھہرنے کے وقت ہلکا پھلکا پاتے ہو اور ان کی اُون اور ان کی پشم اور

ہے۔قرآن کریم نے اس مشکل کو خود ہی حل فرمایا جہاں تیسری جگہ پرندوں کے ذریعہ عذاب بھیجنے کا ذکر کیا ہے ﴿وَّ اَرْسَلَ عَلَيْهِمْ طَيْرًا اَبَابِيْلَ ۙ تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ ۙ﴾[الفيل: 105:3-4] ''اور ان پر جھنڈ کے جھنڈ پرند بھیجے۔ جو ان پر سخت پتھر مارتے تھے۔'' اور خود شر کو بھی طائر کہا ہے ﴿اَلَآ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ عِنْدَ اللّٰهِ﴾[الأعراف: 131:7] ''سنو ان کی شومی صرف اللہ کی طرف سے ہے۔'' اور جب ہم محاورہ عرب کی طرف توجہ کرتے ہیں تو وہاں بھی یہی عجیب بات پاتے ہیں کہ عذاب یا ذلت یا شکست کے متعلق پرندوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ میدانی نے مجمع الامثال میں یہ مثال دی ہے [تُبَدِّرْ بِلَحْمِكَ الطَّيْرِ] جو بددعا ہے یعنی تو ہلاک ہو جائے اور ایسی طرح ہلاک ہو کہ دفن ہونا بھی میسر نہ آئے اور پرندے تیرے گوشت کو کھائیں اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھیلائیں اور نابغہ کا شعر ہے:

اِذَا مَا غَدَا بِالْجَيْشِ حَلَّقَ فَوْقَهُ عَصَائِبَ طَيْرٌ تَهْتَدِيْ بِعَصَائِبِ

یعنی جب وہ لشکر کے ساتھ نکلتا ہے تو اس کے اوپر پرندوں کے جھنڈ حلقہ باندھ لیتے ہیں اور جدھر لشکر چلتے ہیں ان کے ساتھ ہی وہ بھی چلتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایک فاتح فوج کے ساتھ پرند ہوتے ہیں گویا ان کو علم ہو جاتا ہے کہ دشمن اس فوج کے ہاتھ سے مارا جائے گا اور ایسا ہی ابوالطیب کا شعر ہے:

اِذَا لَقُوْا جَيْشًا تَيَقَّنَ اِنَّهُ لِمَنْ بَطَنَ طَيْرٌ تَنُوْفَةُ مَحْشُوْرٌ

یعنی جب ان کا مقابلہ کسی فوج سے ہوتا ہے تو اسے یقین ہو جاتا ہے کہ قیامت کے دن وہ تنوفہ کے پرندوں کے پیٹ سے اٹھائے جائیں گے۔ اور بائبل میں یاجوج ماجوج کی ہلاکت کے لیے ایسے ہی الفاظ میں پیشگوئی کی ہے:

''تو اسرائیل کے پہاڑوں پر گر جائے گا تو اور تیرا سارا لشکر اس گروہ سمیت جو تیرے ساتھ ہے اور میں تجھے ہر قسم کے شکاری پرندوں اور میدان کے درندوں کو خوراک کے لیے دوں گا۔'' [حزقی ایل: 4:39]

پس ان تمام شہادتوں سے ظاہر ہے کہ پرندوں کو روکنے میں اشارہ عذاب اور شر کے روکنے کی طرف ہے جو ان پر آنے والی تھی۔ اور یوں اللہ تعالیٰ کی قدرت کے نظاروں میں سے بھی ہے کہ کس طرح پرند ہوا میں معلق رہتے ہیں۔

اَشْعَارِهَآ اَثَاثًا وَّ مَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ﴿۸۰﴾

ان کے بالوں سے تمہارے لیے اسباب اور ایک وقت مقرر تک سامان (بنایا)۔ (1770)

وَ اللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَّ جَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ﴿۸۱﴾

اور اللہ نے تمہارے لیے اس سے جو پیدا کیا سائے بنائے اور تمہارے لیے پہاڑوں میں چھپنے کی جگہیں بنائیں اور تمہارے لیے کپڑے بنائے جو تمہیں گرمی سے بچاتے ہیں اور (ایسے) کپڑے جو تمہیں تمہاری جنگ میں بچاتے ہیں۔ اسی طرح وہ تم پر اپنی نعمت کو پورا کرتا ہے تاکہ تم فرمانبرداری کرو۔ (1771)

1770 - تَسْتَخِفُّوْنَ۔ خَفِيْفٌ۔ ثقیل کے مقابلہ پر ہے اور یہ کبھی باعتبار وزن ہوتا ہے اور کبھی جس چیز کو آسان سمجھا جائے اسے خفیف کہہ دیا جاتا ہے اور مشکل کو ثقیل۔ اسی معنی میں ہے ﴿اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ﴾ [الأنفال: 66:8] ''اس وقت اللہ نے تمہارا بوجھ ہلکا کر دیا۔'' ﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ﴾ [النسآء: 28:4] ''اللہ چاہتا ہے کہ تم سے (بوجھ) ہلکا کر دے۔'' ﴿فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ﴾ [البقرة: 86:2] ''پس نہ ان سے ہلکا کیا جائے گا۔'' اور کبھی ثقیل بلحاظ وقار بھی کہا جاتا ہے اور خفیف اس کے مقابلہ پر اور اس حالت میں خفیف مذمت کا موقعہ ہوتا ہے اور اسی لحاظ سے اِسْتَخْفَافٌ کے معنی میں اختلاف ہوگا۔ چنانچہ ﴿فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ﴾ [الزخرف: 54:43] ''سو اس نے اپنی قوم کو خفیف کیا تو انہوں نے اس کی بات مان لی۔'' اور ﴿وَّ لَا يَسْتَخِفَّنَّكَ﴾ [الروم: 60:30] ''تجھے خفیف نہ کریں۔'' میں مذمت کا موقعہ ہے اور [خَفُّوْا عَنْ مَنَازِلِهِمْ] سے مراد ہوتی ہے ہلکے پھلکے اپنے گھروں سے چلے اور یہاں استخفاف اسی معنی میں ہے اور خُفَّ موزہ کو کہتے ہیں۔ (غ)

اَصْوَافَ۔ صَوْفٌ کی جمع ہے۔ دُنبہ یا بھیڑ کی اُون۔ اَوْبَارٌ۔ وَبْرٌ کی جمع ہے اونٹ کی پشم اور اَشْعَارَ شَعَرَ کی جمع ہے بکریوں کے بال۔

اَثَاثَ۔ اَثَّ کے معنی ہیں بہت ہوا۔ اور گھر کے سامان کو جب بہت ہو اَثَاثَ کہا جاتا ہے اور مال کو بھی جب بہت ہو اَثَاثَ کہا جاتا ہے اور اس کا واحد کوئی نہیں۔ (غ) اللہ تعالیٰ نے اپنی ظاہری نعمتوں کا ان دو آیات میں ذکر کیا ہے اور غرض اس طرف توجہ دلانا ہے کہ وہ تمہیں روحانی نعمتوں سے کس طرح محروم کر سکتا تھا۔

1771 - سَرَابِيْلَ۔ سِرْبَالٌ کی جمع ہے قمیص کسی قسم کی ہو۔ (غ)

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۸۲﴾

پھر اگر وہ پھر جائیں تو تجھ پر صرف کھول کر پہنچا دینا ہے۔

يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا وَ اَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۳﴾ ع 11 7 17

اللہ کی نعمت کو پہچانتے ہیں پھر اس کا انکار کرتے ہیں اور ان میں سے اکثر ناشکرے ہیں۔ (1772)

وَ يَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا ثُمَّ لَا يُؤْذَنُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ لَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿۸۴﴾

اور جس دن ہم ہر امت میں سے ایک گواہ کھڑا کریں گے پھر جنہوں نے کفر کیا انہیں (بولنے کی) اجازت نہ دی جائے گی اور نہ انہیں عتاب دور کرنے کا موقع دیا جائے گا۔ (1773)

نعمائے ظاہری سے ضرورت وحی پر دلیل:

ان دونوں آیتوں میں ایسی نعمتوں کا ذکر ہے جن سے انسان کو دکھوں اور تکلیفوں سے آرام ملتا ہے۔ چنانچہ پہلی آیت میں گھر اور خیمے اور اس آیت میں سائے اور غاریں اور کرتے مذکور ہیں اور ﴿تَقِيْكُمُ الْحَرَّ﴾ کہہ کر حَرَّ اور بَرْدٌ یعنی گرمی اور سردی دونوں مراد لے لیے ہیں۔ اور اس آیت کے آخر میں اپنی روحانی نعمتوں کی طرف صاف توجہ دلائی جہاں اتمام نعمت کا ذکر کیا۔ کیونکہ اتمام نعمت اس کے بغیر نہ ہوتا تھا کہ جسمانی طور پر تو اس قدر آرام کی چیزیں ہوتی اور روحانی طور پر دکھوں اور تکلیفوں سے بچانے والی کوئی چیز نہ ہوتی۔ اسی مناسبت سے آیت کا خاتمہ تُسْلِمُوْنَ پر کیا۔ یعنی تم اسلام میں یا سلامتی میں داخل ہو جاؤ۔ جس سے مراد روحانی سلامتی ہے اور اگلی آیت میں ﴿فَاِنْ تَوَلَّوْا﴾ کہہ کر بالکل ہی مضمون کو صاف کر دیا۔

1772- ﴿نِعْمَتَ اللّٰهِ﴾ وہی وحی الٰہی ہے جس کا ذکر پچھلی آیت میں بھی ہے اور اس کے معنی محمد ﷺ سدی سے مروی ہیں۔ (ج)

1773- ﴿يُسْتَعْتَبُوْنَ﴾۔ عَتَبَةٌ دہلیز کو کہتے ہیں جو پاؤں سے روندی جاتی ہے۔ (ل) اور عَتَبٌ عتاب یا ناراضگی ہے جو انسان اپنے دل میں دوسرے کے لیے پاتا ہے اور اعتاب کے معنی اظہار عتاب بھی ہیں اور عتاب کا دور کرنا بھی ﴿فَمَا هُمْ مِّنَ الْمُعْتَبِيْنَ﴾ [حٰمٓ السجدة: 24:41] ''تو انہیں معافی نہ دی جائے گی۔'' میں یہی دوسرے معنی ہیں۔ اور اِسْتِعْتَابٌ یہ ہے کہ دوسرے سے یہ چاہا جائے یا اسے یہ موقعہ دیا جائے کہ وہ عتاب کو دور کرے۔ (غ)

نبی کس معنی میں گواہ ہے:

گواہ سے مراد ہر قوم کا نبی ہے اور رکوع کی آخری آیت میں اس کو صاف کر دیا ہے اور نبی کا گواہ ہونا اپنے پیروؤں کے لیے بھی ہے اور مخالفوں کے لیے بھی۔ اول کے لیے اس لحاظ سے کہ قیامت کے دن ان کے ایمان اور اطاعت کی گواہی دے گا اور اس دنیا میں ان کے لیے وہ نمونہ بنتا ہے جیسا کہ فرمایا ﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ

وَ اِذَا رَاَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ وَ لَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۸۵﴾

اور جنہوں نے ظلم کیا جب عذاب کو دیکھیں گے تو نہ وہ ان سے ہلکا کیا جائے گا اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی۔

وَ اِذَا رَاَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا شُرَكَآءَهُمْ قَالُوْا رَبَّنَا هٰۤؤُلَآءِ شُرَكَآؤُنَا الَّذِيْنَ كُنَّا نَدْعُوْا مِنْ دُوْنِكَ ۚ فَاَلْقَوْا اِلَيْهِمُ الْقَوْلَ اِنَّكُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۸۶﴾ۚ

الثلثة

اور جب شرک کرنے والے اپنے شریکوں کو دیکھیں گے کہیں گے اے ہمارے رب یہ ہمارے شریک ہیں جنہیں ہم تیرے سوائے پکارتے تھے تو وہ بات کو ان (کے منہ) پر ماریں گے کہ تم یقیناً جھوٹے ہو۔(1774)

وَ اَلْقَوْا اِلَى اللّٰهِ يَوْمَىِٕذِ اِلسَّلَمَ وَ ضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۸۷﴾

اور اس دن اللہ کے سامنے فرمانبرداری پیش کریں گے اور جو افترا وہ کرتے تھے ان سے جاتا رہے گا۔

الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ﴾[البقرۃ: 143:2] ''اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک اعلیٰ درجہ کا گروہ بنایا ہے تا کہ تم لوگوں کے پیشرو بنو اور رسول تمہارا پیشرو ہو۔'' یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول ﴿ وَ كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ ﴾[المآئدۃ: 117:5] ''اور میں ان پر گواہ تھا جب تک میں ان میں تھا۔'' اور مخالفین کے لیے اس کی گواہی ان کے کفر اور عصیان پر ہوگی ﴿ فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰۤؤُلَآءِ شَهِيْدًا ؁ يَوْمَىِٕذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ عَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ﴾[النسآء: 4:41-42] ''پھر کیا حال ہوگا جب ہم ہر ایک امت سے گواہ لائیں گے اور تجھ کو ہم ان پر گواہ لائیں گے۔ اس دن وہ جنہوں نے کفر کیا اور رسول کی نافرمانی کی، آرزو کریں گے کہ کاش زمین ان پر برابر کر دی جاتی۔'' اور اذن نہ دینے سے مراد عذر پیش کرنے کی اجازت ہے جیسا کہ فرمایا ﴿ وَ لَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ ﴾[المرسلات: 36:77] ''اور نہ انہیں اجازت دی جائے گی کہ عذر پیش کریں۔'' اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ان پر عتاب ہوگا اسے بھی دور کرنے کی اجازت نہ دی جائے گی اس لیے کہ عذر اور عتاب کا دور کرنا اس وقت کوئی فائدہ نہ دے گا۔

1774- دوسری جگہ ہے ﴿ مَّا كُنْتُمْ اِيَّانَا تَعْبُدُوْنَ ﴾[یونس: 28:10] ''تم ہماری عبادت نہ کرتے تھے۔'' اور ایک جگہ ہے ﴿ بَلْ كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ الْجِنَّ ﴾[السبأ: 41:34] ''بلکہ وہ جنوں کی عبادت کرتے تھے۔'' اپنے ہی توہمات کی پرستش کرتے ہیں کیونکہ ان چیزوں کے نیچے کوئی حقیقت نہیں جن کی پرستش بظاہر کرتے ہیں۔

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يُفْسِدُوْنَ ﴿۸۸﴾

وہ جنہوں نے کفر کیا اور اللہ کی راہ سے روکا ہم انہیں عذاب پر عذاب بڑھا کر دیں گے اس لیے کہ وہ فساد کرتے تھے۔ (1775)

وَ يَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ ؕ وَ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّ هُدًى وَّ رَحْمَةً وَّ بُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ﴿۸۹﴾ ع 12 6 18

اور جس دن ہم ہر امت میں سے ان کے اندر سے ایک گواہ کھڑا کر دیں گے اور تجھے ان پر گواہ لائیں گے۔ اور ہم نے تجھ پر کتاب اتاری ہے (جو) ہر چیز کو کھول کر بیان کرنے والی اور فرمانبرداروں کے لیے ہدایت اور رحمت اور خوش خبری (ہے)۔ (1776)

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ وَ اِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَ يَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ وَ الْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۹۰﴾

اللہ تمہیں عدل اور احسان اور قریبیوں کو دینے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی اور برائی اور زیادتی سے روکتا ہے۔ وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم یاد رکھو۔ (1777)

1775 - ان کا جرم صرف خود کفر کرنا نہیں بلکہ دوسروں کو اللہ کی راہ سے روکنا بھی ہے۔ اس لیے عذاب پر عذاب بڑھایا۔

1776 - اس آخری آیت میں وہی ذکر کر کے جو پہلی آیت میں کیا تھا قرآن کریم کا ذکر کیا جس وحی الٰہی کا انکار ہو رہا تھا۔ اور یوں اگلے رکوع کے مضمون سے تعلق قائم کیا۔ اور قرآن کریم کا ﴿تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾ ہونا اس لحاظ سے ہے کہ تمام اصول مذہب کو اس میں کھول کر بیان کیا اور تمام ضروری تعلیم اپنے کمال کو پہنچائی اور تمام اصول باطلہ کی کھول کر تردید کی۔

1777 - **خیر و شر کی جامع تعلیم:** پچھلی آیت میں جب قرآن کریم کو ﴿تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾ کہا تو اب اس کی جامع تعلیم کا ایک نمونہ پیش کیا ہے اور اس آیت میں خیر و شر کو پورے طور پر جمع کیا ہے۔ خیر کی اقسام میں عَدْلِ اور اِحْسَانِ اور ﴿اِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى﴾ کو بیان کیا ہے اور شر میں فَحْشَآءِ اور مُنْكَرِ اور بَغْيِ اور یہ تینوں باتیں ایک ترتیب میں ہیں۔ عدل ادنیٰ درجہ نیکی ہے جو مساوات کے رنگ میں ہے یعنی جو کوئی تمہارے ساتھ نیکی کرے اس کے ساتھ نیکی کرنا یا احسان کے عوض احسان [دیکھو نمبر: 796]۔ احسان وہ نیکی ہے جو بطور ابتدا بغیر کسی معاوضہ کے یا معاوضہ کے خیال کے کی جائے اور ﴿وَ اِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى﴾ سے مراد صرف قریبیوں کو دینا نہیں گو صلہ رحمی بجائے خود ایک ایسی اعلیٰ درجہ کی نیکی ہے جس سے سب نیکیاں پیدا ہوتی ہیں۔ بلکہ ایسا ایتاء مراد ہے جیسے ذی القربیٰ کا ہوتا

وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَ لَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَ قَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۹۱﴾

اور اللہ (تعالیٰ) کے عہد کو پورا کرو جب تم عہد کرلو اور قسموں کو ان کے پکا کرنے کے بعد مت توڑو اور تم اللہ (تعالیٰ) کو اپنا ضامن کر چکے ہو، اللہ جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔ (1778)

ہے۔قریبیوں کو انسان کسی احسان کے خیال سے نہیں دیتا۔ یہ بھی نہیں سمجھتا کہ میں کوئی نیکی کر رہا ہوں بلکہ یہ ایک فطری خواہش کے ماتحت ہوتا ہے۔پس یہ تیسرا مرتبہ یہ چاہتا ہے کہ نیکی انسان میں فطری خواہش کی طرح بن جائے۔ایک کام کو جب انسان بار بار کرتا ہے تو آخر ہوتے ہوتے وہ اس کی طبیعت کا جزو بن جاتا ہے۔پس انسان اس قدر احسان کی عادت کرے اور اس قدر بار بار اس کا اعادہ کرے کہ آخر ہوتے ہوتے احسان کرنا اس کی فطری خواہش کی طرح ہو جائے۔اور اقسام شر میں سب سے پہلے فحشاء کا ذکر کیا یعنی ہر ایک امر جو بذات خود قبیح ہے گو اس کا اثر دوسروں پر ہو یا نہ ہو اور دوسری قسم منکر ہے جسے دوسرے برا منائیں اور اس کا انکار کیا جائے۔ گویا اس کا اثر دوسروں پر بھی پڑتا ہے۔اور تیسری قسم بغی ہے۔جس میں انسان حد سے نکلنا چاہتا ہے وہ گویا ایسا تجاوز ہے جس کا اثر بہت ہی وسیع ہے۔ایک دوسرے رنگ میں فَحْشَاءُ قوت شہویہ سے پیدا ہوتا ہے۔منکر قوت غضبیہ سے، بغی قوت وہمیہ سے۔شہوت کا اثر بد دوسرے انسانوں پر بہت کم پڑتا ہے اور عموماً اس میں ظلم کا رنگ بہت کم ہوتا ہے۔غضب کے اثر بد کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے اور عموماً اس سے دوسرے انسانوں کو تکلیف پہنچتی ہے۔مگر سب سے بڑے مظالم دنیا میں قوائے وہمیہ سے پیدا ہوتے ہیں۔جس کی وجہ سے قوموں کی قومیں اور ملکوں کے ملک صرف ایک وہم کے ماتحت تباہ کر دیئے جاتے ہیں۔اور یہ تینوں قوتیں اگر حالت اعتدال پر آ جائیں تو انسان بدی کی تمام راہوں سے بچ سکتا ہے۔حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اس آیت کو خطبہ جمعہ کے آخر میں داخل کیا۔

1778 - تَنْقُضُوا۔ نَقْضٌ۔ اِبْرَامٌ کی ضد ہے اور اس کے معنی ہیں ایک چیز کے اجزا کا الگ کر دینا اور بکھیر دینا۔اور استعارۃً عہد شکنی پر بولا جاتا ہے ﴿الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ﴾ [البقرة: 27:2] ''جو اللہ کے عہد کو توڑتے ہیں۔'' ﴿يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ﴾ [الأنفال: 56:8] ''اپنا عہد توڑ دیتے ہیں۔'' اور نَقِيْضٌ ایک چیز کی وہ ہے کہ وہ دونوں باتیں صحیح نہیں ہو سکتیں اور ﴿اَنْقَضَ ظَهْرَكَ﴾ [الانشراح: 3:94] ''تیری پیٹھ توڑ رکھی ہے۔'' میں اَنْقَضَ کے معنی ہیں توڑ دیا یہاں تک کہ اس کی نقیض ہو گئی۔(غ)

تَوْكِيْدٌ۔ وَكَّدَ اور اَكَّدَ قول اور فعل دونوں کے لیے آتا ہے جس کے معنی ہیں اسے مضبوط کیا۔

اللہ کا عہد اس کی شریعت ہے یا اس کی وحی اور ﴿اِذَا عٰهَدْتُّمْ﴾ سے ان کا منہ سے قبول کرنا مراد ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ پر جو اللہ کے رسول ہیں ایمان لا کر اور آپ کے ہاتھ پر اقرار کر کے گویا اللہ کو ضامن بنایا گیا کہ ہم اس عہد کو پورا کریں گے۔پس جب قرآن کریم کی ایک اعلیٰ درجہ کی تعلیم بتائی اور یہ بتایا کہ وحی الٰہی تمہیں ہر نیکی کی طرف اور اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کی نیکی کی

وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا ؕ تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ ؕ اِنَّمَا يَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ ؕ وَ لَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۹۲﴾

اور اس عورت کی طرح نہ ہو جاؤ جس نے محنت کر کے کاتا ہوا سوت ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ تم اپنی قسموں کو آپس میں فساد کا موجب بنا لیتے ہو اس لیے کہ ایک جماعت دوسری جماعت سے بڑھ کر ہو۔ اللہ اس طرح صرف تمہیں آزماتا ہے اور وہ ضرور تمہارے لیے قیامت کے دن وہ باتیں کھول کر بیان کرے گا جن میں تم اختلاف کرتے تھے۔ (1779)

طرف بلاتی ہے اور ہر بدی سے روکتی ہے تو اب یہ بھی سمجھایا کہ نرا منہ سے اقرار کر لینا کافی نہیں بلکہ جب تم نے پختہ عہد کیا ہے تو اسے پورا بھی کر کے دکھاؤ۔

1779 - غَزْلَ۔ غَزْلَ عورت کا سوت کاتنا ہے اور مَغْزُوْلُ یعنی کاتے ہوئے سوت کو بھی غَزْلَ کہتے ہیں اور غَزَّلٌ عورتوں کے ساتھ کھیل وغیرہ شغل میں مصروف ہونا ہے۔ (غ)

اَنْكَاث۔ نِكْثٌ کی جمع ہے اور نَكْثَ سوت کا توڑنا یا کپڑے کا ادھیڑنا ہے۔ اور نقض کے قریب قریب ہے اور نقض عہد پر بھی بولا جاتا ہے ﴿وَ اِنْ نَّكَثُوْۤا اَيْمَانَهُمْ﴾ [التوبة: 12:9] ''اور اگر وہ اپنی قسموں کو توڑیں۔'' ﴿اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ﴾ [الأعراف: 135:7] ''تو فوراً عہد شکنی کرتے۔''

دَخَلَ۔ دُخُوْلٌ کے معنی داخل ہونا یا اندر آنا ہیں اور مکان اور زمانہ اور اعمال میں اس کا استعمال ہوتا ہے اور دَخَلٌ فساد اور عداوت سے کنایہ ہے جیسے دَغَلَ (غ)

اَرْبٰی۔ رَبَا سے ہے جس کے معنی ہیں ایک چیز بڑھ گئی اور ترقی کی۔ اور اَرْبٰی سے مراد یہاں ہے گنتی میں زیادہ یا مال میں زیادہ۔

تفرقہ پر ایک مثال:

بخاری میں اور تفاسیر میں ایک عورت کا ذکر ہے جو مکہ میں تھی جو دن بھر کات کات کر شام کو توڑ دیا کرتی تھی اور یہ اس کا جنون تھا۔ مگر سیاق بتاتا ہے اور ایسی ہی روایت مجاہد وغیرہ سے ہے کہ یہ ایک مثال کے طور پر ہے، خاص عورت کا ذکر مقصود نہیں۔ (ج)

گویا یہ پچھلی آیت میں جو فرمایا تھا کہ جب اللہ سے عہد کیا ہے یعنی ایمان لائے ہو تو اسے پورا کرو۔ تو یہاں بتایا کہ اسے پورا نہ کرنا گویا اس عورت کی مثال ہے جو کات کر اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔ بظاہر یہ ایک مجنون کا فعل ہے مگر دنیا کے کتنے عقلمند کہلانے والے ہیں جو اسی فعل کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اپنے ہاتھوں سے ایک عمارت کو کھڑا کرتے ہیں پھر خود اس کی جڑ بنیاد کو

وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ لَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾

اور اگر اللہ چاہتا تو تمہیں ایک ہی گروہ بنا دیتا لیکن وہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے۔ اور ضرور تم سے پوچھا جائے گا جو تم کرتے تھے۔

وَ لَا تَتَّخِذُوْۤا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعْدَ ثُبُوْتِهَا وَ تَذُوْقُوا السُّوْٓءَ بِمَا صَدَدْتُّمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَ لَكُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۹۴﴾

اور اپنی قسموں کو آپس میں فساد کا موجب نہ بناؤ، ایسا نہ ہو کہ قدم جمے پیچھے پھسل جائے اور تم تکلیف کا مزہ چکھو۔ اس لیے کہ تم نے اللہ کی راہ سے روکا اور تمہیں بڑا عذاب ہو۔ (1780)

اکھیڑتے ہیں۔ مسلمانوں کو جس بات سے بچنے کی نصیحت کی تھی انہوں نے اس کا ارتکاب کیا اور اپنے ہی افعال سے اپنے کیے کرائے کام کو بگاڑا اور سب سے زیادہ نقصان جو پہنچا وہ اسی بات سے پہنچا جس کا ذکر یہاں کیا ہے۔ یعنی باہم اختلاف اور ان معاہدات کو مدنظر نہ رکھنا جو ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔ اس وجہ سے کہ ایک جماعت اپنے آپ کو دوسری جماعت سے زبردست دیکھتی ہے یا اس لیے کہ وہ زبردست ہو جائے یہی مسلمانوں کی بیماری ہے جس نے انہیں موجودہ حالت تک پہنچایا۔ جن کی دنیا پر پھیلی ہوئی حکومت اس مجنون عورت کے سوت کی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔

اہل جاہلیت اور معاہدات اور یورپ کی حالت:

مگر اب بھی اس کی اصلاح کی طرف توجہ نہیں ﴿تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ﴾ یہاں جملہ معترضہ کے طور پر ہے۔ جہاں اہل جاہلیت کا ذکر ہے یا عام طور پر دنیا کی روش کا ذکر ہے۔ مسلمانوں کو خاص حکم اس بارہ میں [آیت: 94] میں موجود ہے۔ اہل جاہلیت میں یہ رواج عام تھا کہ معاہدے موجود ہوتے مگر ایک قوم ذرا اپنے آپ کو دوسری سے طاقتور پاتی تو سب معاہدات کو بالائے طاق رکھ دیتی۔ بعینہ جیسے آج یورپ کی حالت ہے کہ جس قوم کو کمزور دیکھا، اس کے ساتھ معاہدہ ردی کاغذ کا ٹکڑا بن جاتا ہے۔

1780 - ﴿فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعْدَ ثُبُوْتِهَا﴾ صاف بتاتا ہے کہ یہ مسلمانوں کا ذکر ہے کہ ان کا قدم جم کر پھر باہمی فسادات سے پھسل جائے گا اور یوں وہ اللہ کی راہ سے روکنے والے ہو جائیں گے اور عذاب بھی ان پر آئے گا۔ کیا آج اسی حکم کی خلاف ورزی کی سزا تو ہم پر نہیں۔

وَ لَا تَشْتَرُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ اِنَّمَا عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۹۵﴾

اور اللہ کے عہد کے بدلے تھوڑی قیمت نہ لو، جو اللہ کے پاس ہے تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ؕ وَ لَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْۤا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾

جو تمہارے پاس ہے وہ جاتا رہے گا اور جو اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے اور جنہوں نے صبر کیا ان کے بہترین اعمال کے لیے جو انہوں نے کیے ہم ضرور انہیں اجر دیں گے۔(1781)

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَ لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۷﴾

جو کوئی اچھا عمل کرتا ہے مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہے ہم یقیناً اسے ایک پاک زندگی میں زندہ رکھیں گے اور ہم انہیں بہترین اعمال کا جو وہ کرتے تھے اجر دیں گے۔(1782)

1781 - يَنْفَدُ ۔ نَفَادَ کے معنی فناء ہیں ﴿اِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهٗ مِنْ نَّفَادٍ ﴿۵۴﴾﴾ [صٓ: 54:38] ''یہ ہمارا (دیا ہوا) رزق ہے جو ختم نہ ہوگا۔'' ﴿لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ﴾ [الکھف: 109:18] ''تو سمندر ختم ہو جائے گا قبل اس کے کہ میرے رب کے کلمات ختم ہوں۔'' مال دنیا ختم ہو جاتا ہے مگر اعمال حسنہ کے نتائج ختم نہیں ہوتے۔

1782 - اس آیت میں جیسا کہ اور بھی کئی موقعوں پر قرآن شریف نے نہایت صفائی سے بتا دیا ہے کہ **اعمال حسنہ کی جزا میں مردوں اور عورتوں میں کوئی فرق نہیں**۔ باوجود ان صراحتوں کے عیسائی کہتے ہیں کہ قرآن شریف کی رو سے عورت میں روح کوئی نہیں جو اصل میں ان کا اپنا خیال تھا۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ یہاں حیات کا ہی ذکر ہے۔ **حیات طیبہ دینے سے کیا مراد ہے**۔ بعض نے کہا اس دنیا کی زندگی جو ہر قسم کی آلائشوں سے پاک ہو وہ مومن کو ہی میسر آتی ہے اور یہ درست ہے۔ بعض نے کہا اس سے مراد برزخ میں پاک زندگی کا عطا فرمانا ہے اور بعض نے کہا آخرت میں یا جنت کی زندگی۔ اور حق یہ ہے کہ تینوں زندگیاں ایک ہی تسلسل میں ہیں۔ بہشتی زندگی اسی دنیا سے شروع ہوتی ہے اور یقیناً وہ قبر میں بھی رہتی ہے اور پھر قیامت کو اپنی پوری چمکار کے ساتھ ظاہر ہوگی۔ مراتب ضرور ہیں مگر چیز ایک ہی ہے۔ اور اسی پاک زندگی کا یہاں ذکر ہے جو یہاں سے شروع ہو کر ترقی کرتی

فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿۹۸﴾

سو جب تو قرآن پڑھنے لگے تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگ۔ (1783)

اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۹۹﴾

کیوں کہ اس کا کوئی غلبہ ان لوگوں پر نہیں جو ایمان لائے اور اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔

اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَ الَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ ع 13 11 19

اس کا غلبہ صرف انہی لوگوں پر ہے جو اسے دوست بناتے ہیں اور وہ جو اس کے ساتھ شریک بنانے والے ہیں۔ (1784)

چلی جائے گی اور ختم کبھی نہ ہوگی۔ قیامت کے ظہور کے بعد پھر اس کے اور کمالات ظاہر ہوں گے۔ ﴿وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ﴾۔

1783 - **تلاوت قرآن اور استعاذہ:** ﴿فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ﴾ سے مراد ہے جب قرآن شریف پڑھنے لگو تو اس وقت استعاذہ کرلیا کرو۔ اور سب سے مشہور استعاذہ ﴿اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ﴾ (صحيح البخارى، كتاب الادب، باب الْحَذَرِ مِنَ الْغَضَبِ؛ 6115) ہے جو اسی آیت کے حکم کی تعمیل ہے اور بعض روایتوں میں ﴿اَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ﴾ (سنن ابى داؤد، كتاب الصلوٰة، باب مَنْ رَأَى الِاسْتِفْتَاحَ بِسُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ، حديث:775) بھی آیا ہے۔ اور تعامل سے بھی یہی ثابت ہے کہ اعوذ قرآن شریف کے شروع کرتے وقت پڑھا جاتا ہے اور ختم کرکے پڑھنا مراد نہیں۔ ہاں یہ سچ ہے کہ استعاذہ کی ضرورت ہر وقت ہے اور خاتمہ پر بھی ہے اور قرآن کریم کا خاتمہ بھی معوذتین پر ہی ہے اور ظاہر حکم کی تعلیم تو لفظوں میں ہوتی ہے مگر مراد یہی ہے کہ انسان ہر اس راہ سے جو شیطان کی طرف لے جاتی ہے بچنے کی کوشش کرے اور اللہ تعالیٰ کی پناہ تلاش کرے اور قرآن شریف تو خود اللہ تعالیٰ کی راہ ہے۔ پس اس کے پڑھنے سے پہلے شیطان سے بچنے کی درخواست بارگاہ الٰہی میں کرنا عین مناسب موقعہ ہے۔ پھر اس کی تعلیم پر قیام بھی سوائے اس کے میسر نہیں آ سکتا۔

1784 - **شیطان کا تسلط کس پر ہے:** ان دو آیات میں نہ صرف یہ بتادیا کہ مومنوں پر شیطان کا کوئی تسلط نہیں بلکہ یہ بھی بتادیا کہ ان کا تسلط انہی لوگوں پر ہوتا ہے جو خود اس کی ولایت میں جاتے ہیں اور اسے اپنا دوست بناتے ہیں۔ ورنہ کسی شخص پر بھی شیطان کا تسلط نہیں۔ ﴿اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ﴾ [الحجر: 42:15] ''کہ میرے بندوں پر تیرا کوئی غلبہ نہیں۔''

﴿هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ﴾ کے ایک تو وہ معنی ہیں جو ترجمہ میں اختیار کیے گئے ہیں۔ یعنی اس کی وجہ سے یا اس کے اغوا سے شرک اختیار کرتے ہیں اور بِهٖ میں ضمیر رَبِّهِمْ کی طرف بھی جاسکتی ہے۔ یعنی وہ اللہ کے ساتھ شریک کرتے ہیں اور ایک معنی یہ بھی کیے گئے ہیں کہ شیطان کو اپنے اعمال میں شریک کرتے ہیں۔

وَ اِذَا بَدَّلْنَاۤ اٰیَةً مَّكَانَ اٰیَةٍ ۙ وَّ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا یُنَزِّلُ قَالُوْۤا اِنَّمَاۤ اَنْتَ مُفْتَرٍ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝۱۰۱

اور جب ہم ایک پیغام کی جگہ دوسرا پیغام بھیجتے ہیں اور اللہ بہتر جانتا ہے جو وہ اتارتا ہے، کہتے ہیں تُو تو افترا کرنے والا ہے بلکہ ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔ (1785)

قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِیُثَبِّتَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ هُدًى وَّ بُشْرٰى لِلْمُسْلِمِیْنَ ۝۱۰۲

کہہ اسے روح القدس نے تیرے رب کی طرف سے حق کے ساتھ اتارا ہے تاکہ انہیں مضبوط کرے جو ایمان لائے اور وہ فرمانبرداروں کے لیے ہدایت اور خوشخبری ہے۔

1785 - **قرآن میں نسخ نہیں:** تمام مفسرین نے اس آیت کے یہ معنی کیے ہیں کہ ہم ایک آیت قرآنی کو منسوخ کر کے اس کی جگہ دوسری لاتے ہیں حالانکہ ادنیٰ تدبر سے بھی معلوم ہوسکتا ہے کہ آیت قرآنی کے منسوخ ہونے کا یہاں کوئی ذکر نہیں۔ اول یہ کہ یہ کفار کا قول ہے اور ان کو اس سے کیا واسطہ تھا کہ آج کون سا حکم قرآنی منسوخ ہوا ہے اور کون سا قائم ہے۔ وہ تو اصول کے ہی مخالف تھے اور یہ تو ہوا نہیں کہ پہلے قرآن شریف نے کبھی شرک کو جائز رکھا پھر منسوخ کر دیا ہو کہ کفار ایسا کہتے۔ دوم یہ کہ سیاق عبارت ناسخ و منسوخ کی بحث کو نہیں چاہتا۔ اصل مضمون کفار کے مقابلہ پر وحی الٰہی کی صداقت کو ثابت کرنا ہے اور آگے [آیت:103] میں صاف ان کا قول مذکور ہے کہ ایک بشر آپ کو سکھاتا ہے۔ سوم یہ کہ یہ سورت مکی ہے اور جن آیات کو ناسخ کہا جاتا ہے وہ سب مدینہ کی نازل شدہ ہیں۔ جب مکہ میں تفصیلات شریعت ہی نازل نہیں ہوئیں تو منسوخ کیا چیز کی گئی۔ اور یہ قطعی دلیل ہے کہ اس آیت میں ناسخ و منسوخ قرآنی کا کوئی ذکر نہیں۔ چہارم یہاں تبدیل آیت کا ذکر ہے جس سے معلوم ہوا کہ یہاں ان آیات کا ذکر ہے جو قرآن کریم کے اندر نہیں۔ اس لیے بین الدفتین کے ناسخ و منسوخ کا یہاں کوئی ذکر نہیں اور ایسی کسی آیت کا ہمیں علم نہیں جو منسوخ التلاوۃ اور منسوخ الحکم ہو۔ پنجم اگلی آیت میں اس کے نازل کرنے کی غرض یہ بتائی کہ مومنوں کو مضبوط کیا جائے اور مسلموں کے لیے ہدایت اور بشارت ہو۔ بعض آیتوں کے بعض کو منسوخ کرنے سے مومن کس طرح مضبوط ہو سکتے تھے۔ اور کسی آیت قرآنی کے منسوخ ہونے میں ان کے لیے ہدایت اور بشارت کیا تھی۔ یہ تو سارے قرآن کے نزول کی شان ہے جیسا کہ فرمایا ﴿لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ﴾ [الفرقان: 32:25] ''تاکہ ہم اس کے ساتھ تیرے دل کو مضبوط کرتے رہیں۔'' ششم جب کفار تک کو یہ علم تھا اور مکہ میں ہی علم تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے فلاں فلاں آیتوں کو جو پہلے قرآن میں تھیں منسوخ کر دیا تو تعجب ہے کہ ایک بھی صحابی ہمیں یہ نہیں بتاتا کہ کبھی آنحضرت ﷺ نے کسی آیت کو منسوخ فرمایا ہو۔ قرآن میں عدم تنسیخ پر اور دلائل کے لیے [دیکھو نمبر: 138]۔

وَ لَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِیْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِیٌّ وَّ هٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۰۳﴾

اور ہم جانتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ اسے تو ایک انسان سکھاتا ہے اس کی زبان جس کی طرف یہ (سکھانے کی) نسبت کرتے ہیں عجمی ہے اور یہ کھلی عربی زبان ہے۔ (1786)

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۙ لَا يَهْدِيْهِمُ اللّٰهُ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾

جو لوگ اللہ کی باتوں پر ایمان نہیں لاتے اللہ انہیں ہدایت نہیں دیتا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

یہاں بھی آیت کے بدلنے سے نئی رسالت یا نئے پیغام الٰہی کا آنا مراد ہے [دیکھو نمبر: 138]۔ اور اس پر قرینہ یہ ہے کہ پچھلے سے پچھلے رکوع میں دوسرے انبیاء کا جو اپنی اپنی قوموں میں آئے ذکر کیا تھا۔ دیکھو [آیت نمبر: 84 ,89]۔ اور پچھلے رکوع میں صرف یہ بتایا کہ قرآن کریم کی تعلیم نیکی سکھانے والی اور بدی سے روکنے والی ہے۔ تو اب کفار کے اس اعتراض کا ذکر کیا کہ جب پہلے بھی رسول آئے تھے تو نئے رسولوں کی کیا ضرورت ہے اور کیوں اس نے سابق شرائع کو منسوخ کیا۔ اس لیے وہ کہتے ہیں کہ یہ تو بہر حال افترا ہے۔ اس کا جواب دیا ہے کہ روح القدس نے اسے نازل کیا ہے اور روح القدس کے نازل کرنے میں یہ اشارہ ہے کہ دنیا گناہ کی ظلمت میں مبتلا تھی اس کے دور کرنے کے لیے اس وحی کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اس نے ایک عالم کو گناہ سے پاک کر کے دکھا بھی دیا اور اس ظلمت کا ذکر رسول اللہ ﷺ کے ظہور کے متعلق پیچھے ہو چکا ہے اور بالحق کہنے میں یہ اشارہ ہے کہ باوجود پہلی رسالتوں کے ایک نئی رسالت کی ضرورت تھی جس پر قرآن کریم میں بار بار دلائل گزر چکے ہیں۔

1786- ﴿يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ﴾ اِلْحَادٌ کے اصل معنی مَيْلٌ اور عُدُوْلٌ ہیں یعنی ایک طرف مائل ہونا یا جھک جانا۔ اور [لَحَدَ اِلَيْهِ بِلِسَانِهٖ] کے معنی ہیں مَالَ یعنی مائل ہوا۔ یہاں اَلْحَدَ ہے اور فراء کا قول ہے کہ ﴿يُلْحِدُوْنَ﴾ کے معنی [يَعْتَرِضُوْنَ] ہیں یعنی اعتراض کرتے ہیں اور ﴿مَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍ بِظُلْمٍ﴾ [الحج: 25:22] ''جو کوئی اس میں ظلم کے ساتھ ناانصافی کا ارادہ کرے۔'' میں الحاد کے معنی اعتراض ہیں اور زجاج نے الحاد کے معنی اللہ کے بارہ میں شک کرنا دیئے ہیں اور ظلم بھی اس کے معنی کیے گئے ہیں۔ (ل)

مخالفین کا اعتراض کہ کوئی انسان آپ کو سکھاتا ہے:

کفار مکہ بھی ایسے اعتراض کرتے تھے اور مخالفت حق میں ان کے پیرو عیسائی بھی یہ اعتراض کرتے ہیں۔ کفار قریش جن لوگوں کا نام لیتے تھے وہ سب اہل کتاب عموماً نومسلم عیسائی تھے جو عجمی لوگ تھے۔ کسی روایت میں جبر کا نام ہے اور کسی میں عَايَشْ یا مِيْعِيْشَ کا اور ایک میں یسار کا (جو کہا جاتا ہے کہ یہودی تھا) اور ایک میں ہے کہ عبداللہ بن مسلم الحضرمی نے کہا کہ ہمارے دو

اِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

جھوٹ تو صرف وہ لوگ بناتے ہیں جو اللہ کی باتوں پر ایمان نہیں لاتے اور وہی جھوٹے ہیں۔ (1787)

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖۤ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَ لٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۰۶﴾

جو شخص اپنے ایمان کے بعد اللہ کا انکار کرتا ہے مگر وہ نہیں جسے مجبور کیا جائے اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہو۔ بلکہ وہ جس کا سینہ کفر پر کھل جائے تو ان پر اللہ کی طرف سے غضب ہے اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔ (1788)

نصرانی غلام تھے یسار اور جبر جو مکہ میں تلواریں بنایا کرتے تھے اور وہ انجیل پڑھا کرتے تھے۔ نبی کریم ﷺ وہاں سے کبھی گزرتے تو ٹھہر جاتے۔ تو مشرک کہتے کہ آپ ان سے سیکھتے ہیں۔ جتنے لوگوں کے نام لیے گئے ہیں وہ سب عجمی تھے اور نومسلم غلام تھے۔ ان میں سے امر اول کو تو صفائی سے بیان کیا ہے۔ قرآن کریم کی زبان ہمیشہ کے لیے عربی زبان کی فصاحت کا معیار ہوگئی اسے کوئی عجمی کب سکھا سکتا تھا؟ اور امر دوم کی طرف اگلی آیت میں اشارہ کیا ہے جہاں یہ ذکر ہے کہ اسلام کی خاطر کیا کیا تکلیفیں لوگوں کو اٹھانی پڑیں۔ اول تو ایسے لوگ جو خود سکھاتے ہوں مسلمان ہی کس طرح ہو سکتے تھے۔ پھر ان ایذاؤں اور تکلیفوں کو برداشت وہ کیوں کرتے جب جانتے تھے کہ یہ نرا جھوٹ ہے جو ہم خود سکھا رہے ہیں۔ جن دکھوں اور تکلیفوں میں سے مسلمان گزرے انہوں نے ان کے اخلاص پر تو ضرور مہر لگا دی اور جو کوئی چاہے کہے افترا کرنے والے یا افترا میں حصہ لینے والے انہیں کوئی نہیں کہہ سکتا۔

1787 - ان دونوں آیتوں میں بتایا کہ یہ لوگ یعنی رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھی مفتری نہیں ہو سکتے کیونکہ جو اللہ پر افترا کرتا ہے وہ آیات اللہ پر ایمان نہیں لا سکتا اور جو آیات اللہ پر ایمان نہیں لاتا وہ اس ہدایت پر قائم نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ خطرناک دکھوں اور تکلیفوں کا مقابلہ افترا کرنے والے نہیں کر سکتے۔ اگلی آیت میں اسی مضمون کو اور کھولا ہے۔

1788 - **حالت مجبوری میں کلمہ کفر:** اصل غرض تو اسی بات کا بیان کرنا ہے کہ کس ہمت اور کس قوت ایمانی سے مسلمانوں نے مصائب کا مقابلہ کیا۔ اسی ضمن میں ان لوگوں کا ذکر بھی کر دیا جو بعض وقت بتقاضائے بشریت کافروں کے ظلم کے نیچے منہ سے کوئی ایسی بات کہہ دیتے ہیں جن سے ان کی جان بچ جائے بشرطیکہ قلب میں ایمان ہو۔ لیکن جو کفر کے دباؤ کے نیچے آ کر کفر پر راضی ہو جائیں تو ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا کہ وہ غضب الٰہی کے نیچے ہیں۔ رہے وہ جو ایک وقت قلب میں تو کچھ انکار نہیں پاتے لیکن زبان سے انکار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں تو یہ کوئی اعلیٰ مقام نہیں۔ ہاں چونکہ جان بچانے کی مجبوری کے لیے وہ ایسا

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۷﴾

یہ اس لیے کہ انہوں نے دنیا کی زندگی آخرت پر عزیز رکھی اور کہ اللہ (تعالیٰ) کافر لوگوں کو منزل مقصود پر نہیں پہنچاتا۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ سَمْعِهِمْ وَ اَبْصَارِهِمْ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۰۸﴾

یہی وہ ہیں جن کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر اللہ نے مہر لگا دی ہے اور وہی غافل ہیں۔ (1789)

لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۰۹﴾

کچھ شک نہیں کہ وہی آخرت میں نقصان اٹھانے والے ہیں۔

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَ صَبَرُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۰﴾ ع 14 10 20

پھر تیرا رب ان لوگوں کے لیے جنہوں نے اس کے بعد کہ انہیں دکھ دیا گیا ہجرت کی پھر جہاد کیا اور صبر کیا یقیناً تیرا رب اس کے بعد حفاظت کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔ (1790)

کرتے ہیں اس لیے ایک حد تک انہیں قابل معافی سمجھا ہے۔ چنانچہ ان دو شخصوں کے معاملہ میں جن میں سے ایک نے جان بچانے کے لیے مسیلمہ کذاب کے سامنے کلمہ کا انکار کیا اور دوسرا بوجہ اپنی ثابت قدمی کے شہید کیا گیا، نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ایک نے رخصت سے فائدہ اٹھایا مگر دوسرے نے حق کو نہ چھپایا سو اس کے لیے مبارک ہے اور اصل میں ایمان

مسلمانوں کا ایمان اور اخلاص:

کامل یہی ہے کہ جان کی بھی پروا اس کے مقابلہ میں انسان نہ کرے اور یہی اکثر مسلمانوں نے کیا۔ ایسے لوگوں کی مثالیں جنہوں نے کافروں کے ظلم کے نیچے کلمہ کفر کہہ دیا ہو شاذ و نادر ملیں گی مگر ان لوگوں کی مثالیں جنہوں نے خوش دلی سے نہ صرف تکلیفیں اٹھائیں بلکہ گردنیں بھی کٹوائیں قدم قدم پر ملتی ہیں۔ [مَا أُبَالِي حِينَ أُقْتَلُ مُسْلِمًا عَلَى أَيِّ شِقٍّ كَانَ لِلّٰهِ مَصْرَعِي] (صحيح بخاری، كتاب المغازی، باب غَزْوَةُ الرَّجِيعِ وَرِعْلٍ وَذَكْوَانَ وَبِئْرِ مَعُونَةَ، حديث: 4086)

1789 - اللہ کن کے دلوں پر مہر لگاتا ہے؟ جو دنیا کی زندگی میں غرق ہو کر آخرت کی پروا نہیں کرتے اور وہ مہر کیا ہے؟ ان کی وہ حالت قلبی ہے جس کا نقشہ یہ ہے ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ﴾

1790 - **ہجرت حبش اور ہجرت مدینہ:** آخر میں ان لوگوں کا ذکر کیا جو نہ صرف خوش دلی سے اللہ کی راہ میں ہر قسم کے مصائب

يَوْمَ تَاْتِيْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا وَ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾

جس دن ہر شخص اپنی ہی ذات کے لیے جھگڑا کرتا آئے گا اور ہر شخص کو جو اس نے کیا پورا دیا جائے گا اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ (1791)

وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَ الْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۱۱۲﴾

اور اللہ ایک بستی کی مثال بیان کرتا ہے جو امن اور اطمینان کی حالت میں تھی، اس کی روزی ہر جگہ سے اس کے پاس بافراغت آتی تھی پھر اس نے اللہ کی نعمتوں کا انکار کیا تو اللہ نے اسے بھوک اور خوف کے لباس کا مزہ چکھایا، اس کا بدلہ جو وہ کرتے تھے۔ (1792)

برداشت کرتے ہیں بلکہ آخر گھر بار کو، وطن کو، عزیز و اقارب کو بدی سے بچنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ بلکہ پھر اللہ کی راہ میں جہاد بھی کرتے ہیں۔ یعنی اپنا سارا زور بھی لگاتے ہیں اور پورے استقلال سے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایسے کامل الایمان لوگوں کے لیے اللہ کا غفور ہونا یہی معنی رکھتا ہے کہ وہ انہیں اپنی حفاظت میں لے کر گناہوں سے پاک کر دیتا ہے۔ اس سورت میں دوبارہ ہجرت کا ذکر ہے اور اس سے مراد مدینہ کی ہجرت ہی ہے جس سے اس کے زمانہ نزول کا پتہ بھی لگتا ہے۔ کیونکہ اگر ہجرت حبشہ کا ذکر ہوتا تو پہلی بہت سے سورتوں میں بھی اس کا ذکر ہوتا جو درمیانی زمانہ کی نازل شدہ ہیں۔ اس ہجرت کا ذکر قرآن کریم نے اس لیے نہیں کیا کہ وہ ہجرت جس سے علم الٰہی میں مسلمانوں کی کامیابیاں وابستہ تھیں مدینہ کی ہجرت ہی تھی۔ مکی سورتوں میں جہاد کا ذکر جب ابھی قتال کی اجازت نازل نہیں ہوئی صاف بتاتا ہے کہ یہ جہاد اعلائے کلمۃ اللہ ہے جو ہر مسلمان کا سب سے پہلا فرض ہے۔

1791 - ﴿تُجَادِلُ﴾۔ [جَدَلْتُ الْحَبْلَ] کے معنی ہیں میں نے رسّہ کو مضبوط بٹا اور عمارت کے مضبوط بنانے پر بھی یہی بولا جاتا ہے۔ اور جدال یہ ہے کہ گویا ہر شخص دوسرے کو اپنی رائے سے ہٹانا چاہتا ہے۔ (غ) یعنی دلائل کے ساتھ جھگڑنا ﴿وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾ [125] ﴿الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْ اٰيٰتِ اللّٰهِ﴾ [المؤمن: 35:40] ''جو اللہ کی آیتوں کے بارے میں جھگڑتے ہیں۔'' ﴿قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا﴾ [هود: 32:11] ''تو ہم سے جھگڑا اور ہم سے بہتیرا جھگڑ چکا۔'' ﴿يُجَادِلُنَا فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ﴾ [هود: 74:11] ''لوط کی قوم کی نسبت ہم سے جھگڑنے لگا۔'' اور یہاں مراد جھگڑا کرنے سے اپنی خلاصی کا جھگڑا یا کوشش یا اس کے لیے عذروں کا پیش کرنا ہے۔

1792 - ﴿لِبَاسَ الْجُوْعِ وَ الْخَوْفِ﴾ لِبَاسٌ وہ چیز ہے جو پہنی جاتی ہے یا جسم کو ڈھانک لیتی ہے اور خوف اور جوع کو لباس کہا گویا اس

وَ لَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَ هُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

اور ان کے پاس ایک رسول انہی میں سے آیا تو انہوں نے اسے جھٹلایا سو عذاب نے انہیں آلیا اور وہ ظالم تھے۔

فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۪ وَّ اشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۱۴﴾

سو اس سے جو تمہیں اللہ نے دیا ہے حلال اچھی چیزیں کھاؤ اور اللہ کی نعمت کا شکر کرو، اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو۔

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَ الدَّمَ وَ لَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَ مَاۤ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾

اس نے تم پر صرف مردار اور خون اور سؤر کا گوشت حرام کیا ہے اور وہ جس پر اللہ کے سوائے کسی دوسرے کا نام پکارا جائے پھر جو شخص ناچار ہو جائے نہ خواہش کرنے والا اور نہ حد سے بڑھنے والا تو اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ (1793)

نے جسم اختیار کر کے لباس کی صورت اختیار کر لی۔ (غ) اور چاروں طرف سے انسان کو ڈھانک لیا۔

اہل مکہ کی سزا:

یہ قریہ یا بستی جس کی مثال دی ہے مکہ ہے۔ (ج) امن اور اطمینان کی وہ حالت جو دنیا میں کسی بستی کو میسر نہیں آئی اور باوجود وادیٔ غیر ذی زرع ہونے کے ہر قسم کے پھل اور غلہ وہاں پہنچتا۔ سارے عرب کی چیزیں گھر بیٹھے ان کے پاس پہنچ جاتیں، اللہ کی نعمتوں کی ناشکری یہ کہ جب سب سے بڑی روحانی نعمت ملی تو اسے قبول نہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے بھوک اور خوف کے رنگ میں عذاب آیا۔ بھوک تو یہ کہ سات سال کا قحط پڑا جس کی پیشگوئی پہلے سے ہو چکی تھی ﴿فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَاْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ ۙ﴾ [الدخان: 10:44] ''سو اس دن کا انتظار کر جب آسمان کھلا دھواں لائے۔'' اور خوف اس لحاظ سے کہ اسلام کی قوت روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ دوسرے مدینہ میں مسلمانوں کی ہجرت کی وجہ سے تجارت کے رک جانے کا خوف، تیسرے آئندہ جنگوں کی وجہ سے خوف۔ امن و اطمینان کی جگہ بھوک اور خوف کفران نعمت یعنی انکار رسول کی سزا تھی جیسا کہ اگلی آیت میں صاف ذکر ہے۔ الفاظ قرآنی کے عجائبات ختم نہیں ہوتے اور آج بھی یہ لفظ کسی بستی پر صادق آتے ہیں۔

1793 - اہل مکہ جو قرآن کو افترا کہتے تھے انہیں بتایا ہے کہ جو حق ہے اسے تم افترا کہتے ہو اور خود افترا کرتے ہو۔ چنانچہ غذاؤں کی حلت و

وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّ هٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ﴿۱۱۶﴾

اور اسے جو تمہاری زبانیں جھوٹ بیان کر دیتی ہیں نہ کہا کرو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام، تاکہ اللہ پر جھوٹ بناؤ جو اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں وہ کامیاب نہیں ہوتے۔

مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۪ وَّ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۱۷﴾

تھوڑا سامان ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

وَ عَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ ۚ وَ مَا ظَلَمْنٰهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

اور ان پر جو یہودی ہیں ہم نے وہی حرام کیا تھا جو تجھ پر پہلے بیان کر چکے ہیں اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا لیکن وہ اپنی جانوں پر خود ہی ظلم کرتے تھے۔ (1794)

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَ اَصْلَحُوْۤا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۹﴾ ع 15 9 21

پھر تیرا رب ان لوگوں کے لیے جو نادانی سے بدی کر بیٹھتے ہیں پھر اس کے بعد توبہ کرتے ہیں اور اصلاح کر لیتے ہیں یقیناً تیرا رب اس کے بعد حفاظت کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔ (1795)

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ؕ وَ لَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۲۰﴾

ابراہیم ایک امام اللہ کا فرمانبردار اور راست رو تھا اور وہ مشرکوں میں سے نہیں تھا۔ (1796)

حرمت کے متعلق وہ اللہ تعالیٰ پر یہ افترا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یوں حکم دیا ہے۔ اگلی آیت میں اسے اور صاف کیا ہے۔

1794 - یہ [سورہ الانعام 6: 147] میں بیان ہو چکا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سورہ انعام اس سورت سے پہلے نازل ہوئی تھی۔

1795 - سزا اور عذاب کے ذکر کے ساتھ یہ بشارت بھی ہے کہ یہ تم جہالت سے برے کام کر رہے ہو۔ اگر توبہ کرو اور اصلاح کرو تو اللہ تعالیٰ نہ صرف یہ گناہ بخش دے گا بلکہ تم پر رحم بھی کرے گا۔

1796 - اُمَّةً۔ اُمَّةٌ جماعت کو کہتے ہیں اور امام راغب نے یہاں معنی کیے ہیں کہ اللہ کی عبادت میں ایک جماعت کے قائم مقام تھے۔

شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ ؕ اِجْتَبٰىهُ وَ هَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۲۱﴾

اس کی نعمتوں کا شکر کرنے والا، اس نے اسے چن لیا اور اسے سیدھے راستہ کی طرف ہدایت کی۔

وَ اٰتَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ؕ وَ اِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۲۲﴾ ؕ

اور ہم نے اسے دنیا میں بھلائی دی اور وہ آخرت میں یقیناً نیکوں میں سے ہے۔

ثُمَّ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۲۳﴾

پھر ہم نے تیری طرف وحی کی کہ ابراہیم راست رو کے دین پر چل اور وہ مشرکوں میں سے نہیں تھا۔ (1797)

اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۲۴﴾

سبت (کا وبال) صرف ان لوگوں پر ڈالا گیا جنہوں نے اس میں اختلاف کیا اور تیرا رب قیامت کے دن ضرور ان میں ان باتوں کا فیصلہ کرے گا جن میں وہ اختلاف کرتے تھے۔ (1798)

(غ) لیکن اس کے اور معنی بھی آئے ہیں۔ چنانچہ ہر شخص کو جو دین حق پر ہو کر سب ادیان کا مخالف ہو اُمَّةٌ کہا جاتا ہے اور ایسا ہی وہ شخص جو اپنی نظیر نہیں رکھتا اور ابوعبیدہ نے اس کے معنی امام کیے ہیں اور معلم خیر بھی اس کے معنی کیے گئے ہیں۔ (ل)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر اس آخری رکوع میں دو وجہ سے کیا۔ ایک کفار کو توجہ دلانے کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام جن کی وہ پیروی کا دعویٰ کرتے ہیں مشرک نہ تھے۔ دوسرے مسلمانوں کو بتانے کے لیے کہ وہ اس شخص کا طریق اختیار کریں جو دنیا میں راست بازوں کا سردار ہوا۔ اور پھر اپنے زمانہ میں بے نظیر انسان تھا جس نے حق کی پیروی میں کسی کی پروا نہیں کی اور ابراہیم علیہ السلام کو امت کہنے میں یہ اشارہ ہے کہ نیکی کے معلم دنیا کے ہمیشہ سردار بن جاتے ہیں۔ پس اگر مسلمان بھی دنیا میں نیکی کے معلم بنیں تو وہ بھی دنیا کے پیشوا بنا دیئے جائیں گے۔ چنانچہ ﴿وَ اِنْ عَاقَبْتُمْ﴾ [126] اور ﴿اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا﴾ [128] میں مسلمانوں کی آئندہ شوکت کی طرف صاف اشارہ ہے۔

1797 - **ملت ابراہیمی پر چلنے کا ارشاد:** یعنی وہی کام کرو جو ابراہیم نے کیا۔ مطلب یہ ہے کہ تم بھی شرک کی بیخ کنی کرو جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کی۔ کیونکہ ملت ابراہیمی کا اصل الاصول تو یہی بیان کیا کہ وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔ شرک سے دنیا کو صاف کرنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بھی مقصد تھا۔ یہی مقصد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا تھا۔ نیز [دیکھو نمبر: 740, 980]۔

1798 - السَّبْتُ۔ سَبَتٌ کے اصل معنی قطع عمل ہیں۔ [دیکھو نمبر: 94] اور یہاں راغب نے مراد لیا ہے [تَرَكَ الْعَمَلُ فِيْهِ] یعنی اس

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ	اپنے رب کے رستے کی طرف حکمت اور اچھے وعظ سے بلا
الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ	اور ان کے ساتھ اس طریق پر بحث کر جو نہایت عمدہ ہو۔
هِیَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ	تیرا رب اسے خوب جانتا ہے جو اس کے رستے سے

دن کام کا ترک کرنا اور سَبَتٌ کے معنی مدت زمانہ بھی ہیں تھوڑی ہو یا بہت۔

یہودیوں اور عیسائیوں کا سبت:

اس آیت کے ماتحت مفسرین نے بخاری اور مسلم کی ایک حدیث نقل کی ہے۔ بخاری کے لفظ یہ ہیں [نَحْنُ الْآخِرُونَ السَّابِقُونَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، بَيْدَ أَنَّهُمْ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِنَا، ثُمَّ هَذَا يَوْمُهُمُ الَّذِي فُرِضَ عَلَيْهِمْ فَاخْتَلَفُوا فِيهِ، فَهَدَانَا اللهُ، فَالنَّاسُ لَنَا فِيهِ تَبَعٌ، الْيَهُودُ غَدًا وَالنَّصَارَى بَعْدَ غَدٍ](صحيح بخاری، كتاب الجمعة، باب فَرْضِ الْجُمُعَةِ ، حديث: 876) ہم پیچھے آنے والے قیامت کے دن سب سے پہلے ہوں گے سوائے اس کے کہ انہیں ہم سے پہلے کتاب دی گئی۔ پھر ان کا دن تھا جو اللہ نے ان پر فرض کیا۔ مگر انہوں نے اس میں اختلاف کیا۔ پس اللہ نے ہمیں اس کی طرف ہدایت دی۔ سو لوگ ہمارے پیرو ہیں۔ یہود کل اور عیسائی کل کے بعد۔ اور مسلم میں کچھ لفظوں کا اختلاف ہے اور اس کے ابتدائی لفظ یوں ہیں [أَضَلَّ اللهُ عَنِ الْجُمُعَةِ مَنْ كَانَ قَبْلَنَا فَكَانَ لِلْيَهُودِ يَوْمُ السَّبْتِ وَكَانَ لِلنَّصَارَى يَوْمُ الأَحَدِ فَجَاءَ اللهُ بِنَا فَهَدَانَا اللهُ لِيَوْمِ الْجُمُعَةِ](صحيح مسلم، كتاب الجمعة، باب هِدَايَةِ هَذِهِ الأُمَّةِ لِيَوْمِ الْجُمُعَةِ، حديث:2019) اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جو ہم سے پہلے تھے جمعہ سے محروم رکھا۔ سو یہودیوں کے لیے ہفتہ کا دن تھا اور عیسائیوں کے لیے اتوار کا۔ پھر اللہ ہمیں لایا اور ہمیں جمعہ کے دن کے لیے رہنمائی فرمائی۔ مفسرین نے آیت اور ان احادیث کا مطلب یہ لے لیا کہ اللہ تعالیٰ نے پہلی قوموں کے لیے جمعہ کا دن ہی عبادت کا دن قرار دیا تھا۔ مگر انہوں نے خود ہفتہ اور اتوار کا دن اختیار کیا۔ اب آیت میں تو یہ ذکر قطعاً نہیں اور بخاری کی حدیث کا اگر یہ مطلب لیا بھی جائے جہاں دن کا نام بھی نہیں تو مسلم کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی یوم جمعہ سے ان لوگوں کو محروم رکھا اور ہفتہ اور اتوار کا دن ان کے لیے مقرر کیا۔ اور یہودیوں نے باہم تو کوئی اختلاف سبت کے بارہ میں نہیں کیا نہ عیسائیوں نے بلکہ ان کے سبت متفقہ طور پر ہفتہ اور اتوار ہی رہے۔ اور اتنے بڑے تعامل قومی میں اس قدر اختلاف ہونا بھی مشکل ہے۔ پھر یہود کے اندر نبی پر نبی آتے رہے اگر کسی وقت انہوں نے اس کو بدل دیا تھا تو اس کی اصلاح انبیاء کر دیتے اور بخاری کی حدیث کا مطلب کچھ اور ہونا چاہیے۔

سبت میں اختلاف سے مراد:

ممکن ہے یہی مراد ہو کہ اس امر پر یعنی نبی کریم ﷺ پر پہلے عرب لوگ ایمان لائے بعد میں یہود و نصاریٰ لائیں گے۔ اور آیت کا مطلب سبت کے معنی عبادت کا دن لے کر یوں بھی ہو سکتے ہیں [جَعَلَ وَ بَالَ تَرْكَ تَعْظِيْمُ السَّبْتَ] یعنی سبت کی

ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۲۵﴾

گمراہ ہوا اور وہ سیدھی راہ پر چلنے والوں کو بھی خوب جانتا ہے۔ (1799)

وَ اِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ؕ وَ لَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۲۶﴾

اور اگر تم (انہیں) بدلہ دو تو اتنا دو جتنی تمہیں تکلیف دی گئی ہے اور اگر تم صبر کرو تو یہ صبر کرنے والوں کے لیے بہت اچھا ہے۔

وَ اصْبِرْ وَ مَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَ لَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَ لَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۲۷﴾

اور صبر کر اور تیرا صبر اللہ کی مدد سے ہی ہے اور ان پر افسوس نہ کر اور اس کی وجہ سے تنگ نہ ہو جو وہ تدبیریں کرتے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّ الَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ﴿۱۲۸﴾ ع 16 9 22

اللہ ان کے ساتھ ہے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور وہ جو احسان کرنے والے ہیں۔ (1800)

تعظیم کو ترک کرنے کا وبال ان لوگوں پر آیا جنہوں نے سبت میں اختلاف کیا۔ یعنی سبت کی تعظیم کو قائم نہ رکھا۔ اور یہ معنی مفسرین نے کیے ہیں اور یا سبت کے اصل معنی قطع عمل لے کر یہ مراد ہوگی کہ جن لوگوں نے قرآن شریف کے متعلق اختلاف کیا یا اسے نہ مانا ان کے عمل قطع ہو گئے۔ کیونکہ قرآن کریم اعمال صالحہ کی طرف توجہ دلاتا ہے اور بلحاظ سیاق یہ معنی سب سے زیادہ موزوں ہیں۔

1799 - چونکہ اس سورت میں وحی الٰہی کی صداقت کا مسئلہ ہر قسم کے دلائل سے قائم کیا ہے اس لیے اس کے خاتمہ پر وحی کی اصل غرض دعوت الی الحق کا ذکر کیا اور اس کا طریق بتایا۔ حکمت مضبوط بات یا فہم ہے یا مضبوط دلیل اور وعظ تنبیہ کے لیے ہے۔ دعوت الی الحق میں یہی دو چیزیں ضروری ہیں۔ نہ دلائل محکمہ کے بغیر دعوت کا کام ہو سکتا ہے نہ وعظ کے بغیر۔ اس کے بعد جدال کا ذکر ہے یعنی بحث کا اس لیے کہ دعوت میں بحث کی بھی ضرورت پیش آ جاتی ہے۔ پس اگر بحث کی ضرورت پیش آئے تو عمدہ طریق پر بحث کی جائے جس سے دلوں میں تنفر اور باطل پر اصرار پیدا نہ ہو بلکہ حق بات کے فہم میں مدد ملے۔

1800 - عُقَابٌ فعل بد کے پیچھے اس کی سزا لانا ہے اور مطلق سزا یا دکھ پہنچانے کے معنی میں بھی آتا ہے۔

دعوت الی الحق میں صبر کی ضرورت اور غلبہ کی پیشگوئی:

پس مراد یہ ہے کہ تمہیں جو دکھ اور تکلیفیں دی جاتی ہیں ان کی سزا دینے کا موقعہ ملے تو اس سے زیادہ سزا نہ دو جس قدر تکلیف تمہیں پہنچائی گئی ہے۔ بلکہ بہتر یہی ہے کہ تم صبر سے ہی کام لو اور بدلہ نہ لو۔ دعوت الی الحق میں اس کا ذکر اس لیے کیا کہ دعوت الی الحق کرنے والے لوگوں کو تکلیفیں بھی اٹھانی پڑتی ہیں۔ اگر وہ دنیا کے لوگوں کی طرح غلبہ کے وقت انتقام لیں تو دل ان سے متنفر ہو جائیں۔ اس لیے فرمایا کہ تمہارا کام یہی ہے کہ دکھ برداشت کرو اور کام کرتے جاؤ۔ ہاں اگر کبھی ضرورت سزا دینے کی ہو تو اسی قدر سزا ہو جس قدر تکلیف تمہیں پہنچائی گئی تھی۔ سزا دینے کا ذکر کر کے صاف بتا دیا کہ تمہیں دنیا میں اس قدر غلبہ دیا جائے گا کہ تم اپنے مخالفین کو سزا دینے پر قادر ہو گے۔ اس آیت کا تعلق نہ سمجھنے کی وجہ سے اسے مدنی بھی کہہ دیا گیا ہے۔ مگر اعتراض تو پھر بھی باقی رہے گا کہ اسے یہاں کیوں رکھا اور حق یہی ہے کہ یہ مکی ہے۔ اگلی آیت میں پھر صبر کی تاکید ہے تا کہ معلوم ہو کہ یہی اصل چیز ہے جس پر تعلیم قرآنی زور دیتی ہے۔ دشمنوں کی ایذا پر صبر کے بغیر دعوت الی الحق کا کام سرانجام نہیں دیا جا سکتا اور سب سے آخری آیت میں یہ عظیم الشان خوش خبری تسلی کے طور پر دی کہ اللہ تقویٰ اختیار کرنے والوں اور احسان کرنے والوں کے ساتھ ہے۔